جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء

خانقاہِ معلیٰ حضرت مولانا محمد علیؒ، مکھڈ شریف (اٹک)

پیر طریقت رہبر شریعت

حضرت مولانا محمد دین رحمۃ اللہ علیہ مکھڈی، مکھڈ شریف (اٹک)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سہ ماہی مجلّہ

قندیلِ سلیمان

مکھڈ شریف (اٹک)

جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء

بفیضان نظر: شہباز چشت حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ

بیادگار: حضرت مولانا محمد علی مکھڈیؒ مکھڈ شریف

تصوف و روحانی اقدار کا ترجمان

زیر سرپرستی

حضرت مولانا فتح الدین چشتی مدظلہ العالی

مدیر اعلیٰ

محمد ساجد نظامی

مدیر منتظم

ڈاکٹر محمد امین الدین

مدیر معاون

محسن علی عباسی

مجلس تحریر و مشاورت

نذر صابری ــــــ اٹک

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

شاکر القادری چشتی نظامی ــــــ اٹک

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

پروفیسر نصر اللہ معینی، منہاج انٹرنیشنل یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر طاہر مسعود قاضی، الخیر یونیورسٹی، بھمبر (آزاد کشمیر)

ہدیہ سالانہ: چار صد روپے

فی شمارہ: ایک سو روپے

سرکولیشن منیجر: فدا حسین ہاشمی ● کمپوزنگ: محمد ذوالفقار ● تصاویر: محمد زاہد محمود

پرنٹرز/پبلشرز: نظامیہ دارالاشاعت، خانقاہ معلیٰ حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی، مکھڈ شریف (اٹک)

فون: 0334-8506343 | 0343-5894737 | 0346-8506343 | 0333-5456555

ای میل: qandeel.e.suleman@gmail.com | sajidnizami92@gmail.com

فہرستِ مندرجات

گوشۂ عقیدت:

خیابانِ مضامین:

گوشۂ نذر صابریؒ:

صلی اللہ علیہ وسلم

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

ایک پیامی نے کم وبیش ایک صدی قبل یہ پیغام اپنی قوم کے راہبروں کو دیا تھا۔اس پیغام کی ہمہ گیری وہمہ جہتی کا تقاضا کچھ اور تھا لیکن ہم اس کی تفہیم صحیح طور نہ کر سکے۔قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔حضرت داتا گنج بخشؒ جو پیغام لے کر سرزمینِ لاہور میں اترے، حضرت خواجہ معین الدینؒ غریب نواز نے سرزمین اجمیر کو اپنے قدموں سے ہم پائے عرش بنا دیا، خواجہ قطبؒ ونظامؒ نے دلی کو جہاں آباد کی صورت عطا کی اور بابا فریدؒ کے قدم اجودھن کو پاک پتن میں بدلتے چلے گئے۔اور یہی سلسلہ روشنیاں بکھیرتا، پیار کے گیت گاتا، دلوں کو اُجالتا زمان ومکاں کی قید سے ماورا ہمیں ۲۱ ویں صدی کی دہلیز تک لے آتا ہے۔

محرم الحرام سے نئے اسلامی سال کا آغاز ۱۴۳۵ھ کا دروا کرتا ہے۔ہم نئے اسلامی سال کا آغاز حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بے باک اور ایمان افروز زندگی کے واقعات کی قرأت سے کرتے ہیں۔پھر بابا فرید الدین گنج شکرؒ و دیگر بزرگانِ دین کے اعراس کی محافل سے مختلف خانقاہوں پر عقیدت مندوں کا جمِ غفیر جمع ہوتا ہے اور خاصانِ خدا کی بارگاہ میں اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتا ہے۔صفر المظفر میں ہمارے پیر غوثِ زماں شاہ سلیمانؒ کے عرسِ پاک کی محافل اپنی تابناکیوں سے ہمارے تاریک دلوں کو تابانیاں عطا کرتی ہیں۔

صفر المظفر کے بعد ربیع النور کی آمد ہوتی ہے۔ربیع النور میں سارا ماحول ہی بقعۂ نور بن جاتا ہے۔یہ ماہ اُس ماہِ منور کی اس دنیا میں تشریف آوری کا مہینہ ہے جس کے نور کی تابناکیاں تمام کائنات کو منور کیے ہوئے ہیں۔ہم گناہگاروں کو یہ ماہِ نور اس تاریک تر ماحول میں بھی جینے کے لیے روشنیاں عطا کرتا ہے۔ہم جو اپنے خدا اور رسول ﷺ کے تمام پیغامات کو بھول چکے، اپنے محسنوں کو بھول چکے، جانے کس گڑھے کے جانب محوِ سفر ہیں۔ہم خود، ہمارا معاشرہ اور ہمارے

حکمران سبھی ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ آج ہمارے پاس اطاعتِ خدا و رسول ﷺ نہیں صرف اسلاف کے قصے باقی ہیں۔ ہم ایک قصہ گو کی طرح کہانیاں سننے اور سنانے میں مصروف ہیں لیکن ہمارے شب و روز اپنے اسلاف کی پیروی کے بجائے غیروں کے شعار کو اپنانے میں گزرتے ہیں۔ بقول اقبالؒ:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

آج امتِ مسلمہ کو بیک وقت کئی چیلنجز کا سامنا ہے۔ ہم اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ اب وہ وقت آ چکا ہے کہ اہلِ اسلام ایک ہو کر طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کریں، ورنہ:

تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس معاشرے کو سدھارنے میں خانقاہیں آج بھی فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اپنے طور پر ہر جگہ کم یا زیادہ کام ہو رہا ہے لیکن آج انفرادی کام کی نہیں اجتماعی کاوشوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں مل کر آج کی فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ہمیں انفرادی سوچ، انفرادی کاوش اور انفرادی جدوجہد اس مشکل سے نہیں نکال سکتی، ہم اجتماعی سوچ، اجتماعی کاوش اور اجتماعی جدوجہد سے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں، ہمیں کامیابی کے لیے اپنے اسلاف کی زندگیوں کا نہ صرف مطالعہ کرنا ہوگا بلکہ ان کی پیروی میں چلتے ہوئے خود کو اور اپنے معاشرے کو سدھارنے کی کاوشیں تیز تر کرنی ہوگی چاہے اس کے لیے ہمیں اپنی جان تک کی بازی لگانی پڑے۔ یہی رسمِ شبیری ہے۔ ''قندیلِ سلیماں'' اسی پیغام کو آپ تک پہنچانے کی خدمت سرانجام دینے کے لیے کوشاں ہے۔

☆

''قندیلِ سلیماں'' کا دوسرا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ یہ شمارہ بوجوہ ایک سہ ماہی کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ ہم کوشاں ہیں کہ آئندہ ہر شمارہ وقت پر شائع ہو۔ ان شاء اللہ

کسی رسالے کا معیار اس کے لکھنے والے بناتے ہیں۔ ہم آپ کی تحریروں کے منتظر ہیں۔ اہلِ فکر ونظر کی علمی وادبی تحریری ہماری اور ہمارے قارئین کے لیے رہبری کا سامان مہیا کرتی رہیں گی۔

☆

۱۱ دسمبر ۲۰۱۳ء کو معروف محقق، ادیب اور شاعر جناب نذر صابریؒ ہم سے جدا ہو گئے۔ ان کا وصال اس پورے خطے کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ کتاب اور کتب خانہ اُن کی پہچان تھی۔ اٹک کے تمام قدیمی خانقاہی کتب خانے اور اہلِ علم کی ذاتی ذخائر ان کے پیشِ نظر رہے۔ وہ ہمیشہ ان کتب خانوں میں موجود کتب کے تحفظ اور ان کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے کتب خانہ سے انھیں خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ مولاناؒ کی ذاتِ گرامی سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ میرے ساتھ ان کی محبت وشفقت کا سبب مولاناؒ اور آپ کا کتب خانہ تھا۔ گفت وشنید کا محور ہمیشہ یہی کتب خانہ رہا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی ذات کئی خوبیوں کا مرقع تھی۔ اللہ رب العزت اپنے حبیبِ کریم کے تصدق میں انھیں کروٹ کروٹ راحت عطا کرے، ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ''قندیل سلیماں'' کے اس شمارے میں ایک گوشہ اُن کے نام سے منسوب ہے۔ اُن کی ذات کی خوبیاں یا جہتیں کسی گوشے، کسی ''نذر صابری نمبر'' کی محتاج نہیں۔ ایک ہدیۂ عقیدت ہے، ایک محبت کا انداز ہے، ایک تعلق کا اظہار ہے جس کو نبھانے چلے ہیں:

گر قبول افتد زہے عز وشرف

محمد ساجد نظامی

حمدِ باری تعالیٰ

حضرت بُلھے شاہؒ

الف اللہ نال رتا دِل میرا
مینوں "ب" دی خبر نہ کائی
"ب" پڑھیاں مینوں سمجھ نہ آوے
لذّت الف دی آئی
"ع" "غ" دی ہکو صورت
ایہو گل الف سمجھائی
بلّھیا ، قول الف دے پورے
جیہڑے دِل دی کرن صفائی

❁

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

علامہ محمد اقبالؒ

نعت رسول مقبول ﷺ

_____ حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی

اے ہادیِ راہِ خدا ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ
اے قدوۂ اہلِ صفا ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

در مسجد و مکتب توئی ، در مشرق و مغرب توئی
مطلوب ہر طالب توئی ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

ذکرِ تو در ہر انجمن ، وصفِ تو گوید مرد و زن
نامِ تو در روم و یمن ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

شد نہٗ فلک معراج تو، عرب و عجم تاراج تو
شاہ و گدا محتاجِ تو ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

در مدرسہ غوغائے تو، در خانقاہ سودائے تو
عالم ہمہ شیدائے تو ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

از قدسیاں بردی سبق ، قدسی زِ تو گوید سبق
از تو منور نُہ طبق ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

اے دردِ من، درمانِ من، اے دینِ من، ایمانِ من
اے جانِ من ، جانانِ من ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

شد تاجِ لولاکت بہ سر ، زِنگشت تو شق شد قمر
فضلِ تو بر جن و بشر ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

از ہر چہ بود اوّل توئی، ختمِ نبوت ہم توئی
اوّل توئی ، آخر توئی ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

کُن مولوؔی را محترم ، تا از سگانِ تو شوم
در عشق و شوقت جاں دِہم ، یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

ترجمہ

پروفیسر نصر اللہ معینی

۱۔اے راہِ خدا کے ہادی اور صفائے باطن کی نعمت پانے والوں کے پیشوا، اے مصطفیٰ کریم ﷺ
۲۔مسجد و مکتب میں اور مشرق و مغرب میں آپ کا ہی چرچا ہے اور اے مصطفیٰ کریم ﷺ آپ ہی ہر طالب کے مطلوب ہیں۔
۳۔ہر محفل میں آپ کا ہی ذکر ہوتا ہے، ہر مرد و زن آپ کے اوصاف بیان کرنے میں مصروف ہیں، آپ کا نام ہی روم اور یمن میں گونج رہا ہے۔
۴۔نو، افلاک پر آپ کو معراج کرایا گیا، عرب و عجم آپ کے زیرِ نگیں ہوئے اور شاہ و گدا آپ کے محتاج ہیں۔

۵۔مدرسہ میں آپ کی تعلیمات کا چرچا ہے، اہلِ خانقاہ بھی آپ کی محبت میں مست ہیں اور ساری دنیا ہی آپ کی دیوانی ہے۔

۶۔فرشتوں سے آپ سبقت لے گئے، قدسی بھی آپ سے سبق لیتے ہیں۔نو طبق آپ کی ذات سے ہی منور ہوتے ہیں۔

۷۔اے مجھے درد دینے والے، اے میرا علاج کرنے والے، اے میرا دین اور ایمان اور اے میری جان اور میرے محبوب۔

۸۔آپ کا طور (جہاں خدا سے ہم کلام ہوئے) عرش بریں ہے، ساری زمین آپ کی مسجد قرار دی گئی اور روح الامین بھی آپ کے خادم ہیں۔

۹۔لو لا ک لما خلقت الا فلا ک، کا تاج آپ کو پہنایا گیا۔آپ کی انگشت مبارک کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا اور آپ کے فضل و کرم سے جن و بشر مستفید ہو رہے ہیں۔

۱۰۔آپ کی تخلیق ساری کائنات سے پہلے ہوئی اور خاتم النبین ﷺ بھی آپ ہیں اس لیے اوّل بھی آپ ہیں اور آخر بھی آپ۔

۱۱۔مولوی (شاعر) کو عزت بخشیے! تا کہ میں آپ کے سگانِ در میں شامل ہو جاؤں اور آپ کی محبت اور شوق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دوں۔یا مصطفیٰ یا مصطفیٰ

صلی اللہ علیک و علی آلک و اصحابک صلوۃ لا تُحصی

نعتِ رسول مقبول ﷺ

احمد ندیم قاسمی

اس قدر کون محبت کا صلہ دیتا ہے
اس کا بندہ ہوں جو بندے کو خدا دیتا ہے
جب اترتی ہے مری روح میں عظمت اس کی
مجھ کو مسجودِ ملائک کا بنا دیتا ہے
رہنمائی کے یہ تیور ہیں کہ مجھ میں بس کر
وہ مجھے میرے ہی جوہر کا پتا دیتا ہے
اس کے ارشاد سے مجھ پہ مرے اسرار کھلے
کہ وہ ہر لفظ میں آئینہ دکھا دیتا ہے
ظلمتِ دہر میں جب بھی میں پکاروں اس کو
وہ مرے قلب کی قندیل جلا دیتا ہے
وہی نمٹے گا مری فکر کے سناٹوں سے
بت کدوں کو جو اذانوں سے بسا دیتا ہے
وہی سرسبز کرے گا مرے ویرانوں کو
آندھیوں کو بھی جو کردارِ صبا دیتا ہے
قصرِ شاہاں سے گزر جاتا ہے چپ چاپ ندیمؔ
درِ محمد ﷺ کا جب آئے تو صدا دیتا ہے

منقبت بہ حضور

خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہی رحمۃ اللہ علیہ

______ پروفیسر بشیر احمد رضوی ☆

نظام الدین محبوبِ الٰہی
مبارک تم کو دائم کجکلاہی

ترے منگتے سلاطینِ زمانہ
ترے در کی گدا ، فرمانروائی

تو اخلاقِ الٰہی سے مزیّن
ترا کردار ، عکسِ مصطفائی

اُڑائے ہند میں حق کے پھریرے
گزاری زندگی، بن کر سپاہی

کیے ہیں سرنگوں باطل کے جھنڈے
تعالٰی اللہ تری خیبر کشائی

☆ پنڈی گھیب (اٹک)

ترے مِدحت سرا ، اقطابِ عالم
کروں کیا ، میں تری مِدحت سرائی

طفیلِ خسروِ رشکِ عنادل
عطا ہو بابِ عالی تک رسائی

ہے ''لا یشقیٰ'' سے ظاہر اس کا رُتبہ
صلہ اس کا ہے فضلِ کبریائی

بشیرؔ ادنیٰ گدا ہے ترے در کا
ہے شاہی سے بھی بہتر یہ گدائی

محبتِ رسول ﷺ اور اس کے تقاضے

علامہ محمد عمر فیض قادری☆

اس دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی سے محبت ضرور کرتا ہے۔اس حقیقت کا انکار کوئی بھی عقل مند انسان نہیں کرے گا کہ محبت کا جذبہ فیاضِ ازل نے انسانی فطرت Human Nature اور انسانی جبلت میں رکھ دیا ہے۔ماں ہے تو اسے اپنی اولاد سے محبت ہے اگر وہ بیٹا ہے یا بیٹی ہے تو اسے اپنے والدین سے محبت ہے۔اگر وہ بھائی ہے تو بہن سے محبت کرتا ہے اگر وہ بہن ہے تو بھائی سے محبت کرتی ہے۔الغرض جذبہءِ محبت کسی نہ کسی صورت میں پیکرِ انسانی میں جلوہ گر ہے۔انسان کو تو انسان ہی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ محبت کرنے والا ہے۔اگر آپ غور فرمائیں تو آپ میری اس بات سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ انسان تو انسان رہا خلاق کائنات نے جذبہءمحبت سے جانوروں تک کو محروم نہیں رکھا۔آپ نے بار بار اس چیز کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ اگر کسی چڑیا کے گھونسلے سے اس کے بچے اٹھا لیے جائیں تو وہ کتنی مضطرب ہو جاتی ہے۔کتنی بے چینی کے ساتھ انسانی سر پر منڈلانے لگتی ہے،اور کتنے غصے سے چیخنے چلانے لگتی ہے۔کسی مرغی کے چوزوں کو پکڑنے لگیں تو وہ انھیں اپنی آغوش میں محفوظ کرلیتی ہے۔پروانے کو شمع سے عشق ہے،بلبل پھولوں سے محبت کرتی ہے،چکور چاند کی گرویدہ ہے۔ان حقائق کا اعتراف ہر انسان کرتا ہے۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ جب اس پیکرِ حسن و جمال کی محبت میں تڑپنے کی بات کی جائے،عشق میں جلنے کی بات کی جائے اور فراق میں پھڑکنے،پگھلنے اور گھلنے کی بات کی جائے جو فقط حسین نہیں سراپا حسن تھا جو فقط جمیل نہیں اجمل تھا تو بعض محروم القسمت اور خبیث الفطرت لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ سب قصے کہانیاں ہیں،دقیانوسی خیالات ہیں۔عشق رسول میں مچلنا،نعتیں پڑھنا،میلاد النبی کے جشن منانا،یارسول اللہ کے نعرے لگانا،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم

☆مذہبی اسکالر۔راولپنڈی

گرامی ''محمد'' صلی اللہ علیہ وسلم سن کر انگوٹھے چومنا وغیرہ سب ڈرامہ ہے، محض ایک ڈھونگ ہے۔ان چیزوں کا دین میں اور اسلامی تعلیمات میں کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ تو ہم بعد میں عرض کریں گے کہ اسلام کی بنیاد ہی محبت پر قائم ہے۔ اسلام و ایمان کے ثبوت کے لیے صرف اقرار باللسان ہی کافی نہیں آتی جب تک دل اس طرف مکمل طور پر جھک نہ جائے اور دل کا مکمل طور پر کسی طرف جھک جانا ہی محبت ہے۔ اس کی تفصیل تو ہم لفظِ محبت کی تفسیر و تشریح میں کریں گے۔ سرِ دست اتنا سمجھ لیں کہ محبت دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جسے چھوا نہیں جاسکتا۔ سونگھا نہیں جا سکتا اور زبان سے چکھا نہیں جا سکتا۔ یہ ایک جذبہ ہے، ایک کیفیت ہے جسے فقط محسوس کیا جا سکتا ہے۔

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کناروں سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

قطبِ دوراں تاجدارِ گولڑہ حضرت پیر مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں لاہور میں ایک کتب خانہ (Library) میں مصروفِ مطالعہ تھا کہ پاس ہی فرش پر بیٹھے ہوئے ایک مجذوب فقیر نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

خوں نابۂ دل خور کہ شرابے بہ ازیں نیست
دنداں بہ جگر زن کہ کبابے بہ ازیں نیست

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدا را
در صفحۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

ترجمہ:

یعنی خونِ دل پیا کر کہ اس سے بہتر کوئی شراب نہیں۔ پارۂ جگر کھایا کر کہ اس سے بہتر کوئی کباب نہیں۔ کنز و ہدایہ (فقہ کی دو مشہور کتابیں) میں خدا نہیں ملتا صفحۂ دل کا مطالعہ کر کہ اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔

مگر یہ باتیں سمجھنے سمجھانے کی نہیں بلکہ پینے اور پلانے کی باتیں ہیں۔ اگر کسی شخص نے کبھی آم نہ کھایا ہو آپ ہزاروں دلائل و براہین سے اسے آم کا ذائقہ، اس کی لذت اور مٹھاس سمجھانے کی کوشش کریں، اسے آشنائی نہیں ہوگی، اسے سمجھانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ اسے آم کا ایک ٹکڑا کھلا دیں، وہ سمجھ جائے گا آم کیسا ہوتا ہے، کسی نے عمر بھر شہد نہیں پیا، دلائل سے اسے حقیقت آشنا نہیں کر سکیں گے۔ ایک ہی راستہ ہے اسے شہد کا ایک گھونٹ پلا دیں۔

دوستانِ گرامی قدر! کچھ چیزیں دیکھنے سے سمجھ میں آتی ہیں۔ کچھ کی معرفت سونگھنے سے ہوتی ہے اور کسی کا عرفان پی کر ہوتا ہے۔ بلاشبہ جوہرِ محبت کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہر انسان میں موجود ہے۔ جس کا وہ ادراک کر سکتا ہے لیکن مدراج محبت کی پہچان کے لیے ضروری ہے کہ تخمِ محبت کو آہِ سحر گاہی، نالہ ہائے نیم شبی اور اشکہائے فرقت سے یوں پروان چڑھایا جائے کہ کسی محبت کرنے والے کی محبت کا جو رنگ بھی سامنے آئے تو بندہ غالبؔ کے اس مصرع کا مصداق قرار پائے کہ ع میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کہتے ہیں کسی شخص کی بینائی جاتی رہی۔ لوگ افسوس کرنے آتے رہے اس نے کسی کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی کچھ دیر کے بعد ایک نابینا شخص افسوس کے لیے آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے گلے لگا کر رونے لگا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم ایک نابینا شخص کی آمد پر کیوں رو پڑے۔ وہ کہنے لگا میں اس لیے رویا کہ اب میرا حقیقی درد آشنا آ گیا ہے۔ تمہارا افسوس سطحی اور غیر حقیقی تھا لیکن اس کا افسوس حقیقی ہے کیونکہ یہ بھی اس مرحلے سے گزر رہا ہے جس میں، میں داخل ہو چکا ہوں۔ بقول رومی کشمیریؒ

ع دُکھیا دِی گَل دُکھیا جانے، سُکھیاں نوں کیہ خبراں

میں عرض کر رہا تھا کہ محبت دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ دل کا کسی طرف جھک جانا، طبیعت کا کسی طرف میلان اور جھکاؤ محبت کہلاتا ہے لیکن یہ محبت کا پہلا درجہ ہے جسے تخیل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسے اگر بالترتیب سمجھنا چاہیں اور علیٰ حسبِ مراتب جاننا چاہیں تو جان لیں کہ محبت کا آغاز تخیل میں بدلتا ہے، تصور، توجہ میں تبدیل ہوتا ہے، توجہ طلب میں بدلتی ہے، طلب محبت

میں بدلتی ہے، محبت عشق میں بدلتی ہے، عشق، جنون میں بدلتا ہے اور بالآخر جنوں، استغراق میں بدل جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس مقام پر پہنچ کر بندہ سوائے محبوب کے ہر شے کو بھول جاتا ہے۔ جس کے بارے میں لفظ انسان ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ لفظ انسان کا ماخذ اُنس ہے جس کا معنی ہے اس نے محبت کی اور بعض علمائے لغت کہتے ہیں کہ لفظ انسان کا ماخذ ''نسی'' ہے جس کا معنی ہے وہ بھول گیا۔ مگر صوفیاء فرماتے ہیں کہ یہ دونوں کیفیتیں پیکرِ انسانی میں موجود ہیں اور ان کا باہمی ربط وارتباط ہے کہ ہر انسان میں فطرتاً جوہرِ محبت موجود ہے۔

انسان جب کسی سے محبت کرتا ہے جس کا آغاز تخیل یا خیال یا اس کی طرف میلانِ طبیعت سے ہوتا ہے۔ پھر اس کی محبت بڑھتی جاتی ہے بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ محبّ ہر شے بھول جاتا ہے۔ اس مقام پر'' العشق نار یحرق ماسوسیٰ المحبوب'' کا منظر سامنے آتا ہے۔ یعنی عشق ایک ایسی آگ ہے جو سوائے محبوب کے ہر شے کو جلا دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایمان واسلام کی بنیاد ہی محبت پر قائم ہے۔ اگر تصدیق بالقلب نصیب نہ ہو تو ایمان، نفاق اور منافقت میں بدل جاتا ہے۔ کافر، منافق اور مومن میں یہی فرق ہوتا ہے۔ کہ کافر دل سے بھی انکار کرتا ہے اور زبان سے بھی انکار کرتا ہے اور مومن زبان سے بھی اقرار اور دل سے بھی اقرار کرتا ہے لیکن منافق زبان سے تو اقرار کرتا ہے مگر دل سے انکار کرتا ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے فقط اقرار باللسان کافی نہیں بلکہ تصدیق بالقلب بھی ضروری ہے یعنی دل سے قبول کر لینا، دل سے مان لینا اور یہی محبت ہے۔

اب میں ثباتِ جذبہء محبت اور وجودِ محبت پر قرآن پاک سے ایک دلیل پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ اس سے پہلے لفظ انسان کے ماخذ کے حوالے سے میں عرض کر چکا ہوں کہ انسان کو انسان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ جوہرِ محبت کا حامل ہے۔ چونکہ انسان قرآنی لفظ ہے تو گویا قرآنِ حکیم سے انسانی فطرت میں جوہرِ محبت کا اثبات ہو رہا ہے۔ اب دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیں سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۴: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ

الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ. ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا. وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

ترجمہ: لوگوں کے لیے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت، عورتیں اور بچے اور اوپر، تلے سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان کیے ہوئے گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی۔ یہ جیتی دُنیا کی پونجی ہے اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا۔

ایک طرف ان چیزوں کی محبت پیدا کردی گئی اور دوسری طرف اعلان فرمایاوَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ اور ایمان والوں کواللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں۔ وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا دونوں آیاتِ مقدسہ سے اثباتِ محبت کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا جارہا ہے کہ بیوی بچوں، مال ودولت اور سونا چاندی کی محبت اگر چہ انسان کی فطرت اور طبعیت میں رکھ دی گئی ہے لیکن ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اللہ کی محبت کو ہر محبت پر غالب کر دیتے ہیں اور جن کی ہر محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ لوگ اس مقامِ رفیع کو پا لیتے ہیں کہ انھیں جاہ ومنصب کی کوئی پیشکش جادۂ حق سے منحرف نہیں کرسکتی، مال ودولت کا کوئی ڈھیر انھیں اپنی طرف مائل نہیں کرسکتا اور سونے چاندی کی چمک دمک ان کی نگاہوں کو خیرہ نہیں کرسکتی۔ بقول شاعر

تختِ سکندری پر وہ تھوکتے نہیں
بستر لگا ہوا ہے جن کا تری گلی میں

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اگر انسان میں جذبہ محبت نہیں ہے تو خالق اسے دعوتِ محبت کیوں دے رہا ہے۔ کیوں ارشاد فرمایا جارہا ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَا اَوْلَا دُ کُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ۔

ترجمہ: اے ایمان والوں! اموال واولاد (کی محبت) تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرکے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مخلوق کی محبت کو خالق کی محبت پر غالب کرلو یا مال واولاد کی محبت میں اور ان کی فکر میں

اتنے محو ہو جاؤ کہ ہمیں بھلا دو، خبردار! ایسا کبھی مت کرنا۔ کیونکہ مومن وہ ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتا ہے یعنی یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ مولا کی محبت میں ہر شے بھول جائے لیکن یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ کوئی مردِ مومن مخلوق کی محبت میں خالق کو بھول جائے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس ذاتِ گرامی کے حوالے سے ذکرِ محبت کو آگے بڑھائیں جس کی ذاتِ اقدس خالق ومخلوق دونوں کی محبت کا مرکز ومحور قرار پاتی ہے۔ جو آسمانِ نبوت کا نیرِ اعظم ہے۔ جو فلکِ رسالت کا مہرِ درخشاں ہے اور جو برجِ عظمت کا کواکبِ انور ہے۔ جو سلطنتِ محبت کی اس مسندِ رفیع پر جلوہ فگن ہے جہاں ہر آن، ہر گھڑی اور نہ جانے کب سے اس کا خالق و مالک اس پر گلہائے درود نچھاور کر رہا ہے۔ قدسیانِ فلک مصروفِ تحسیت ہیں اور رحمٰن و رحیم پروردگار اس وظیفہءِ محبت میں کمالِ محبت سے اپنے بندوں کو شامل ہونے کا حکم دیتا ہے۔

جب میرے لب پہ محمد ﷺ کی ثنا آتی ہے
دیر تک دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
جس کے ہر لفظ پہ کہتے ہیں ملائک آمین
ان کے دیوانے کو ایسی بھی دُعا آتی ہے

صَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ وَسَلَاماً عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ

جب ہم قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ پاک اپنی ذات کی محبت کے حوالے سے ایمان والوں کی شدتِ محبت کو بیان فرما رہا ہے کہ ایمان والے اللہ سے شدید بلکہ اشد یعنی بہت ہی شدید محبت کرتے ہیں۔ جیسے فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْ اَشَدُّ حُبّاً لِلّٰہِ لیکن جب ہم بخاری شریف اور دیگر کتبِ احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمانِ عالیشان نظر سے گزرتا ہے۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

ترجمہ: یعنی کوئی شخص تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ اپنے والدین، اپنی

اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر مجھ سے محبت نہ کرے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اثباتِ ایمان اللہ تعالیٰ کی محبت پر موقوف ہے یا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی محبت پر، بندہ اللہ سے محبت کرے یا حضور سرورِ عالم ﷺ سے محبت کرے۔ کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ اپنی شدید محبت کو مدار ایمان قرار دے رہا ہے اور حدیثِ پاک میں حضور ختمی مرتبت ﷺ اپنی شدید محبت کو مدار ایمان قرار دے رہے ہیں۔ اگر چہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی محبت کو ایک ساتھ بھی بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُ كُمْ وَاَبْنَاءُ كُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَ اَزْ وَ اجُكُمْ وَ عَشِيْرَ تكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَ فْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنَ تَرْ ضَوْ نَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْ لِهٖ وَ جِهَادٍ فِي سَبِيْلِهٖ حَتّٰى يَاتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ.

ترجمہ: اے محبوب فرما دو کہ اے لوگو! اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیٹیاں، تمہارا کنبہ، تمہاری کمائی کا مال اور وہ سوداگری جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہارے پسند کیے ہوئے مکان، تم کو اللہ اور اللہ کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں، تو ٹھہرو یہاں تک کہ اللہ اپنا عذاب اتارے اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔

مسلمانو! یہ آیتِ کریمہ صاف صاف بتا رہی ہے کہ ہم پر حضور علیہ السلام کی محبت لازم اور واجب ہے لیکن سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ کس کی محبت پر ایمان موقوف ہے مولا کی محبت پر یا اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی کی محبت پر۔

دوستانِ گرامی! اگر ہم توحید و رسالت کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھا لیں اور خدا اور رسول کے باہمی وصل علاقہ کا جان لیں تو یہ گرہ کھل جاتی ہے اور یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ آیئے قرآن سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کریم اور اس کے رسول کریمؐ کے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَق اَنْ يُرْضُوْهُ

ترجمہ: اللہ اور اس کا رسول اس بات کے سب سے بڑھ کر حق دار ہیں کہ اسے راضی کیا جائے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں ذکر دو ذاتوں یعنی اللہ اور اس کے رسول کا ہو رہا ہے لیکن جب رضا کی بات کی تو ضمیر واحد استعمال فرمائی آیت کریمہ دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَق اَنْ یُرضُوْهُ

ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول کا حق ہے کہ اسے راضی کیا جائے۔

چاہیے یہ تھا کہ جب ذکر دو ذاتوں کا کیا تو تثنیہ کا صیغہ لایا جاتا یعنی یوں فرمایا جاتا اَن یُرْضُوْهُمَا۔ کہ اللہ اور اس کے رسول کا حق ہے کہ انھیں راضی کیا جائے۔ لیکن صیغہ واحد استعمال کیا اور فرمایا یُرْضُوْہُ کہ اسے راضی کیا جائے۔ خدا کی قسم یہ آیت خدا و مصطفیٰ کے باہمی تعلق کی نوعیت بیان کررہی ہے کہ خبردار! ان کو الگ الگ نہ سمجھنا۔ بے شک ذاتیں یہ دو ہی ہیں مگر رضا ان کی ایک ہے۔ ذاتیں یہ دو ہیں مگر مرضی ان کی ایک ہے۔ محبوب کی رضا کو اتنا بلند کیا کہ اسے اپنی رضا بنا دیا۔ محبوب کی اطاعت کی بابت فرمایا: یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللہ۔ جس نے رسولِ محترم کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔ محبوب کی اطاعت کو اتنا بلند کیا کہ اسے اپنی اطاعت بنا دیا۔ محبوب کے فعل اور محبوب کی ادا کو بلند کیا اسے اپنا فعل اور اپنی ادا بنا دیا۔ محبوب کے ادب کی بات کی فرمایا یَااَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَاتُقَدِّمُوا بَیْنَ یَدِیِ اللّٰہِ وَرَسُولہ (الحجرات)۔

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔

اس آیت کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے عید الاضحیٰ کے دن حضور رسالت مآب ﷺ سے پہلے قربانی کر لی تھی۔ انھیں حکم دیا گیا کہ دوبارہ قربانی کرو۔ ٹھیک ہے کہ تم نے قربانی میری رضا کی خاطر کی اور میرے نام پر جانوروں کو ذبح کیا لیکن چونکہ ابھی میرے محبوب ﷺ نے قربانی نہیں کی تھی تم نے محبوب سے قربانی میں پہل کر کے اچھا نہیں کیا۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میرے مصطفیٰ کی قیادت کے بغیر تمہارا یہ عمل قبول ہو جائے گا۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ محبوب سے پہلے جانور قربان کرنے والو! اگر قربانی کا ثواب پانا چاہتے ہو تو پہلے میرے محبوب کا جانور ذبح ہونے دو اور بعد میں تم دوبارہ قربانی کرو۔ اس لیے کہ قربانی کرنے میں تم نے

جو پہل کی ہے۔ یہ پہل مصطفیٰ سے نہیں کی خدا سے پہل کی ہے۔ آیت دوبارہ ملاحظہ فرمائیں یَاۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہ. ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔ لوگوں نے قربانی کرنے میں پہل تو حضور سے کی تھی مگر اللہ فرماتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔ معلوم ہوا کہ حضور کی بے ادبی، اللہ کی بے ادبی قرار پاتی ہے۔ اور حضور کی تعظیم اللہ کی تعظیم قرار پاتی ہے۔ اللہ نے حضور کے ادب کو اور حضور کی تعظیم و تکریم کو اتنا بلند کیا کہ اسے اپنی تعظیم اور اپنا ادب بنادیا۔ محبوب کی ندا کی بات کی فرمایا: یَاۤ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْ اللّٰہِ وَ للرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ (انفال)۔ اے ایمان والوں! اللہ اور اس کے رسول کے بلانے پر حاضر ہو جب تمہیں وہ بلائے۔ پیچھے ذکر دو باتوں کا کیا اذا دعاکم جب تمہیں وہ بلائے صیغہ واحد استعمال کیا۔ قربان جائیں محبوب کی صدا اور محبوب کی ندا کو اتنا بلند کیا کہ اسے اپنی صدا اور ندا بنادیا۔

محبوب کے امر کی بات کی فرمایا۔ مَاکَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِ ھِمْ۔ اور نہ کسی مسلمان مرد اور نہ کسی مسلمان عورت کو حق ہے کہ جب اللہ اور رسول کچھ حکم فرمادیں تو انھیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے۔ (احزاب) اللہ تعالیٰ نے محبوب کے امر، محبوب کے حکم کو بلند کیا تو اسے اپنا حکم بنادیا۔ محبوب کی عطا اور محبوب کے انعامات کی بات کی فرمایا اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ. اے محبوب یاد کرو جب تم فرماتے تھے اس سے جسے اللہ نے نعمت دی اور تم نے اسے نعمت دی (احزاب) یہاں خدا نے محبوب کی عطا کو بلند کیا اور اسے اپنی عطا بنادیا۔

قارئینِ کرام! ہم نے قرآنِ حکیم سے بڑے اختصار کے ساتھ چند دلائل پیش کیے تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے باہمی ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ میرے خیال میں بات بالکل واضح ہو چکی ہے۔ قرآن حکیم بار بار یہی نکتہ سمجھا رہا ہے کہ جس طرح یہ ذاتیں دو ہیں ان کی رضا ایک ہے۔ ذاتیں دو ہیں، اطاعت ان کی ایک ہے۔ ذاتیں دو ہیں، صدا اور ندا ان کی

ایک ہے۔ ذاتیں دو ہیں حکم ان کا ایک ہے۔ ذاتیں دو ہیں، عطا ان کی ایک ہے۔ اسی طرح یہ ذاتیں تو دو ہیں مگر محبت ان کی ایک ہے۔ یہ مانگے تو وہ دیتا ہے وہ دے تو یہ بانٹتا ہے۔ یہ کہے وہ کرتا ہے تو یہ کہتا ہے، یہ روٹھے تو اس کا واسطہ دو یہ مان جاتا ہے وہ روٹھے تو اس کا واسطہ دو وہ مان جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اُس کا محبّ ہے وہ اس کا محبّ ہے۔ یہ اُس کا محبوب ہے وہ اِس کا محبوب ہے۔

حق تعالیٰ بھی کریم اور محمد بھی کریم
دو کریموں میں گنہگار کی بن آئی ہے

اب ہم لفظِ محبت کی تفسیر و تشریح کی طرف آتے ہیں۔ پہلے ہم اس سے لفظ کے مختلف معانی اور مفاہیم کو بیان کریں پھر شرائطِ محبت بیان کریں گے۔

لفظ محبت حَبَّۃ یا حِبَّۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے گندم یا جو کا دانہ۔ حَبٌّ وَ حِبَّۃ۔ خوشبو دار پودوں اور پھولوں کے بیج کو بھی کہتے ہیں۔ جس طرح پودوں اور پھولوں کی نشو و نما، تازگی اور رعنائی، پھولوں میں خوشبو اور پھلوں کی مٹھاس کا دار و مدار بیج اور تخم کے فیض اور تاثیر و تاثر پر ہوتا ہے اسی طرح اس جوہر محبت کا اثر جو انسانی فطرت میں گوندھ دیا گیا پوری انسانی زندگی پر محیط ہوتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس تخمِ محبت کی نشو و نما کس قسم کے حالات اور ماحول میں ہو رہی ہے۔ جس طرح تخم ریزی یا بیج بونے کے بعد اس بیج کی حفاظت کے مناسب اقدامات کیے جاتے ہیں مثلاً ہر وقت آبیاری کرتے رہنا، گرم سرد ہواؤں سے اسے بچانا، خودرو جنگلی جڑی بوٹیوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے اس کی حفاظت کرنا وغیرہ جو اس کو ایک ثمر آور درخت بنانے کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں، اسی طرح جوہرِ محبت کی اگر صحیح خطوط پر نگہداشت کی جائے تو کشتِ دل سے یہ تخمِ محبت ایک صحت مند درخت کی صورت میں اُگتا ہے جسے اگر پاکیزہ فکر اور طاہر ماحول میسر آ جائے تو اپنی شاخوں پر معرفتِ خدا و مصطفیٰ کے وہ پھل پھول لاتا ہے جو ہر خزاں اور بادِ سموم کی دسترس سے آزاد رہتے ہیں۔

خدا و مصطفیٰ کے عشق کے پھل پھول ایسے ہیں
جو ہر موسم میں تر رہتے ہیں مرجھایا نہیں کرتے

بعض کہتے ہیں کہ لفظ محبت حباب الماء سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے پانی کا بلبلہ۔ بلبلے دو صورتوں میں پانی پر پیدا ہوتے ہیں۔ یا تو پانی میں بہت زیادہ حدت اور گرمی پیدا ہو جائے یا پھر پانی میں اضطراب پیدا ہو جائے مثلاً تیز دھا بارش ہونے لگے یا آبشاروں کی شکل میں بلندی سے پانی گر رہا ہو اور پائے پر چوٹ یا ضرب لگ رہی ہو تو بلبلے پیدا ہوتے ہیں۔ حباب الماء کی مناسبت سے محبت کو حب کا نام دیدیا گیا۔ جس پانی میں حدت، جوش اور اضطراب پیدا ہونے سے یا پانی پر ضرب لگنے سے اس کی سطح پر ظاہر ہونے والے بلبلوں کو حباب کہتے ہیں یا اسی طرح جب کسی عاشق کے دل میں محبوب کے عشق اور محبوب کی محبت کی آگ بھڑک اٹھے، یار کی فرقت اور جدائی زندگی کا سکھ چین غارت کر دے اور کاسۂ دل یک نگاہِ نازِ جاناں کی ضرب سے پاش پاش ہو جائے تو انسان کی اس کیفیت کو حب یا محبت کا نام دیتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ محبت **احب البعیر** سے استعارۃً نکلا ہوا لفظ ہے۔ اونٹ جب کسی جگہ یوں جم کر بیٹھ جائے کہ کوشش بسیار کے باوجود اٹھنے کا نام نہ لے تو اونٹ کے اس طرح جم کر بیٹھنے کے انداز کو **احب البعیر** کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں محبت اس کیفیت کا نام ہے جو کسی کی چاہت، لگن اور دھن بن کر دل میں یوں اُتر جائے اور قلب و باطن میں یوں رچ بس جائے کہ وطن چھٹے، گھر لٹے یا سر کٹے مگر اسے کسی طرح بھی دل سے جدا نہ کیا جا سکے۔ میرے اُستاد گرامی ڈاکٹر خورشید حسن رضوی مدظلہ کیا خوب فرماتے ہیں۔

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد

اس گلی کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

بعض علمائے لغت نے کہا لفظ محبت ''حب'' سے نکلا ہے۔ اور ''حب'' اس مٹکے کو کہتے ہیں جو لبالب پانی سے بھرا ہوا ہو اور اس میں مزید پانی ڈالنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس مناسبت سے محبت کا مفہوم یہ ہوگا کسی کی یاد اور کسی کی چاہ سے ظرف دل کا یوں بھرپور ہو جانا کہ محبوب کے سوا کسی غیر کا خیال اور تصور بھی دل میں جگہ نہ پا سکے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ محبوب کے سوا کسی غیر کا تصور تو در کنار خود اپنی ذات بھی بھول جائے، خود اپنا آپ بھی یاد نہ رہے، یہ محبت ہے۔ حضرت

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ایک محب اپنے محبوب کے دروازے پر گیا۔ دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ کون ہے۔ کہنے لگا میں ہوں ترا محب، آواز آئی واپس پلٹ جا۔ تیرا عشق ابھی کچا ہے، پکا نہیں ہوا۔ تیری محبت ابھی ناقص ہے، کامل نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ تیری زبان پر ابھی ''میں'' موجد ہے۔ جا اسے ختم کر کے آ، دیدار کرنے آیا ہے مگر پہلے خود کو دیدار یار کے قابل تو بنا۔ وہ نامراد پلٹ گیا۔ ایک سال تک ہجر اور فراق کی بھٹی میں جلتا رہا۔ جو کھوٹ تھا، وہ نکل گیا۔ پھر محبوب کے دروازے پر آیا دستک دی۔ اندر سے محبوب نے پوچھا کون ہے۔ چیخ نکلی، کہنے لگا دروازہ کھولو اب اندر بھی تو ہے، باہر بھی تو ہے۔ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں جو لوگ محبتِ خدا اور عشقِ مصطفیٰ کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اپنے من میں جھانک کر دیکھیں کہ من میں کہیں ''میں'' تو موجود نہیں ہے۔ کہیں خواہشِ نفس کی پوجا تو نہیں کر رہے ہیں اگر ایسا ہے تو وہ اپنے دعویٰ محبت میں جھوٹے ہیں اس لیے کہ اگر وہ سچے ہوتے تو ان کے سر میں عشقِ مصطفیٰ کا سودا ہوتا اور تن پر سنتِ مصطفیٰ کا لبادہ ہوتا۔ اب ہم اللہ پاک کی توفیق وعنایت سے ان شرائطِ محبت یا علامات کو بیان کرتے ہیں جو ذاتِ رسالت مآب سے محبت کی متقاضی ہیں کیونکہ ہر چیز کی پہچان اور شناخت کے لیے کچھ شواہد اور علامات ہوا کرتی ہیں۔ گویا یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر ہر شخص ذاتِ رسول ﷺ سے اپنی محبت کو پرکھ سکتا ہے، اور معلوم کر سکتا ہے کہ اسے حضور سے کتنی محبت ہے۔

پہلی علامت محبت حضور ﷺ کی اطاعت واتباع ہے۔ یعنی حضور کی سنّت کی پیروی کرنا اور آپ کی سیرت وعادات کو اختیار کرنا۔ جس کام کے کرنے کا آپ نے حکم دیا ہے اسے کبھی نہ چھوڑنا اور جس کام سے آپ نے منع فرما دیا اسے کبھی نہ کرنا، محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی پسند پر اپنی جان قربان کر دی جائے اور کوئی چیز نفس کو کتنی ہی پسند کیوں نہ ہو اگر وہ محبوب کو ناپسند ہے تو اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا جائے۔ جان لیں کہ محبوب کے ساتھ محبت کی تصدیق اس کے ساتھ دعویٰ محبت سے نہیں بلکہ اطاعتِ محبوب سے ہوتی ہے۔

حضرت رابعہ بصری رضی اللہ عنہا اکثر یہ شعر پڑھ کر لوگوں کو اطاعت کی طرف راغب فرمایا

کرتی تھیں۔

تَعَص الْاِ لہٗ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّہٗ
هٰذَا لَعمرِ یْ فِی الْقِیَاسِ بَدِیْعٌ
لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقاً لَاَ طعتہٗ
اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُحِبُّ مُطِیْعٌ

ترجمہ:

تو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کی نافرمانی بھی کرتا ہے، میری عمر کی قسم یہ بات عقل کو بڑی عجیب لگتی ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو، تو اس کی اطاعت کرتا۔ بے شک محبت کرنے والا محبوب کی اطاعت ہی کرتا ہے۔

دوسری علامتِ محبت یا شرطِ محبت آپ کی سنت مطہرہ کا احیا اور اسے زندہ کرنا ہے حدیثِ پاک میں ہے۔ مَنْ اَحْیٰ سُنَّتِی فَقَدْ اَحَبَّنِی وَمَنْ اَحَبَّنِی کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّةِ

ترجمہ: جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے محبوب رکھا اور جس نے مجھے محبوب رکھا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

محبوب کی پرورش اور محبوب کی اداؤں کو اپنانا جن اداؤں پر محبت کرنے والے مرمٹتے ہیں، محبت کا اوّلین تقاضہ ہے۔ کسی عاشق نے کہا:

تیری ہر ادا یاد ہے مجھ کو
اب بلا کا مرا حافظہ ہوگیا ہے

تیسری علامتِ محبت، آپ ﷺ کی تعظیم وتوقیر ہے۔ اپنی اہمیت کے پیش نظر اس شرط و علامت محبت کا ذکر اگر محبت کی سب سے پہلی شرط اور علامت کے طور پر کیا جائے تو بجا ہے۔ اس لیے کہ جس کے دل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ادب اور آقائے دو جہاں کی تعظیم وتوقیر نہیں ہے وہ لاکھ بار حج کرے، عمر بھر نماز پڑھے، روزہ رکھے، ساری زندگی عبادت وریاضت میں گزار

دے، رب کی عزت کی قسم مومن نہیں بن سکتا اس لیے قرآن حکیم نے اطاعت واتباع کا ذکر بعد میں کیا ہے مگر تاجدارِ کائنات کے ادب وتعظیم کی بات پہلے کی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

ترجمہ: پس جو لوگ آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تعظیم وتکریم اور آپ کے مشن کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آپ کے ساتھ اتارا گیا یعنی قرآنِ حکیم یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

فلاحِ دارین کی گارنٹی خوش نصیب لوگوں کو دی جارہی ہے جنھیں ایمان بالرسالت کی سعادت کی ساتھ تعظیم وتوقیرِ رسول، نصرتِ دینِ رسول اور اتباعِ کتابِ رسول کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ غور فرمائیں! تبلیغ ونصرتِ دینِ رسول اور اتباعِ کتابِ رسول سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ادب وتعظیم کو ایمان بالرسالت کے ساتھ بیان کر کے دین میں ادبِ رسول کے مقام کو بیان کیا جارہا ہے۔ ایمان بالرسالت کے بعد پہلی شرط ادبِ نبوت ہے۔ یوں سمجھ لیں جس نے حضور علیہ الصلوۃ کا ادب نہیں کیا وہ بدبخت آپ پر ایمان ہی نہیں لایا۔ کیونکہ

ع ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اس کو بالترتیب یوں سمجھ لیں کہ جس کے دل میں آپ کا ادب نہیں ہے اس کے دل میں آپ کی محبت نہیں ہے اور جس کے دل میں آپ کی محبت نہیں ہے اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔

چوتھی علامت محبت شدتِ شوقِ دیارِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا ہے۔ محبّ کو اپنے محبوب کے دیدار سے بڑھ کر کوئی شے مرغوب نہیں ہوتی ہے۔ بعض عشاق نے کہا ''اَلْمَحَبَّةُ هِيَ الشَّوْقُ اِلَى الْحَبِيْبِ'' ہر محبّ اپنے محبوب کے دیدار کے راستے اور بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ محبوب کی ملاقات سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ محبوب تو محبوب، اس کے دیس کا ذکر سن کر دل مچلنے لگتا ہے۔ اس کے شہر کی بات سن کر آتشِ عشق بھڑک اٹھتی ہے۔ محبوب کی ملاقات میسر نہ ہو تو دیارِ محبوب کی طرف سے آنے والی ہوائیں بھی باعثِ تسکین بن جاتی ہیں۔ اس کے گھر کی منڈیر پر بیٹھنے

والے پرندے بھی یہ سوچ کر پیارے لگتے ہیں کہ ہوسکتا ہے محبوب انھیں دیکھ رہا ہو یا وہ محبوب کو دیکھ رہے ہوں۔ بقول شاعر:

اس کی صورت کو دیکھنے والے
اپنی آنکھوں سے پیار کرتے ہیں

عاشقِ رسول رومیِ کشمیر حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

جنہاں اکھیں دلبر تکیا اوہ اکھاں لئیاں
توں ملیوں تے ساجن ملیا ہن آساں لگ پئیاں

پانچویں علامتِ محبت، حضور نبی اکرم ﷺ کا کثرت کے ساتھ ذکر پاک کرنا اور سننا ہے۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے۔ مَنْ اَحَبَّ شَيئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ۔ جو شخص جس شے کو زیادہ محبوب رکھے گا اس کا ذکر کثرت سے کرے گا۔ تو جس شخص کو حضور علیہ السلام سے سچی محبت ہوگی وہ اکثر آپ کا ذکر پاک کرتا سنائی دے گا۔ اور اپنے آقا کا ذکرِ خیر سن کر خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھے گا۔ اس کی روح پر بہار آجائے گی۔ وہ کبھی نعت شریف کی صورت میں اپنی آتشِ شوق کو ٹھنڈا کرے گا اور کبھی درود و سلام کی شکل میں اپنی تشنگی مٹانے کا سامان مہیا کرے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ مَنْ اَحَبَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ اَكْثَرَ مِنَ الصَّلٰوةِ عَلَيهِ.
ترجمہ: جو نبی اکرم واعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت کرے گا۔ وہ کثرت کے ساتھ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر درود پڑھتا نظر آئے گا۔

درود و سلام سے چڑنے والے ام المومنینؓ کے اس فرمان عالی شان کو پڑھیں اور سوچیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ پر درود پڑھنا کن لوگوں کا شیوہ ہے اور روکنا کن لوگوں کی علامت ہے۔

چھٹی علامتِ محبت، نورِ مجسم ﷺ کے ساتھ منسوب ہر شے سے محبت کرنا ہے۔ بالخصوص آپ کی آلِ پاکؓ اور آپ کے اصحابِ کرامؓ سے محبت کرنا۔ اور ہر اس شے سے محبت کرنا جو حضور کو محبوب اور پسند ہو۔ ایک موقع پر آقا علیہ السلام نے حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو اپنی

بارگاہ میں دیکھ کر فرمایا مَنْ اَحَبَّنِی وَاَحَبَّ هٰذَیْنَ وَ اَبَا هُمَا وَ اُمَّهُمَا کَانَ مَعِی فِیْ دَرَجَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ جو مجھ سے محبت کرے اور میرے ان دونوں نواسوں سے محبت کرے اور ان کے والدین سے محبت کرے وہ قیامت کے دن میرے درجہ میں میرے ساتھ ہوگا۔ (رواہ احمد)

اپنے صحابہ کرام کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ اَللّٰہ اللّٰہ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ۔ میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو! میرے بعد انھیں نشانہ تنقید نہ بنانا۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت میں ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ ان سے بغض رکھا۔

اس باب میں سینکڑوں احادیثِ مبارکہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہم تو صرف یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ آل واصحابِ حضور کے محبوب ہیں اور قاعدہ ہے کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوا کرتا ہے۔ محبوب کے محبوب سے محبت اور محبوب کے دشمن سے دشمنی بھی علامتِ محبت اور شرف محبت ہے۔

دوستانِ گرامی! مذکورہ علامتِ محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ محبوب کے علاقہ سے محبت، محبوب کے شہر سے محبت، محبوب کے گلی کوچوں سے محبت، یہاں تک کہ محبوب کی گلیوں میں پھرنے والے کتوں سے محبت بھی اس میں شامل ہے۔

مجنوں کو لیلیٰ سے عشق تھا۔ ایک بار لوگوں نے دیکھا کہ مجنوں ایک کتے کے پاؤں چوم رہا تھا۔ کسی شاعر نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

پائے سگ بوسیده مجنوں خلق گفتہ ایں چہ بود
گفت گاہے گاہے ایں درکوئے لیلیٰ رفتہ بود

یعنی مجنوں ایک کتے کے پاؤں کو بوسے دے رہا تھا۔ لوگوں نے پوچھا مجنوں کتے کے پاؤں کیوں چومتے ہو، کہنے لگا یہ کبھی کبھی میری محبوب لیلیٰ کی گلیوں میں آتا جاتا ہے۔

دوستو! اس دنیا میں بڑے بڑے حسن وعشق والے گزرے ہیں۔ بے شک عاشقوں نے

اپنے محبوب کے گلی کے کتوں سے بھی پیار کیا ہے۔ مگر تاریخ محبت میں یہ مثال کہیں نہیں ملے گی کہ کسی عاشق نے اپنے محبوب کے کوچہ کا سگ بننے اور کہلانے کی آرزو کی ہو۔ خدا کی قسم یہ رنگ عشق وادب فقط حُسنِ مصطفیٰ کے دیوانوں میں نظر آتا ہے اور شمعِ رسالت کے پروانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ جیسا علامہ اس آرزو میں تڑپتا نظر آتا ہے کہ

سگت را کاش جامیؔ نام بودے

کہ آمد بر زبانت گاہے گاہے

یارسول اللہ! کاش آپ کی گلی کے کتے کا نام جامیؔ ہو۔ کبھی کبھی اس بہانے سے میرا نام آپ کی زبانِ اقدس پر آجاتا۔ مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلویؒ بارگاہِ رسالت مآب میں کس عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔

تجھ سے در، در سے سگ، سگ سے ہے نسبت مجھ کو

میری گردن میں بھی ہے دور کا ڈورا تیرا

کیونکہ

اس نشانی کے جو سگ ہیں نہیں مارے جاتے

حشر تک میرے گلے میں رہے پٹہ تیرا

قطبِ دوراں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑیؒ کیا ایمان افروز خواہش ظاہر کرتے ہیں۔

میں ہوواں سگ مدینے دی گلی دا

ایہو رتبہ ہے ہر کامل ولی دا

مولوی قاسم نانوتوی نے بھی اس تمنا کا اظہار تو کیا مگر افسوس کہ وہ اس جذبے کو سچا ثابت نہ کرسکے، عرض کرتے ہیں۔

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں

مروں تو کھائیں مدینے کے مجھ کو مور و مار

عاشق رسول حافظ مظہر الدین مظہرؔ کا جذبۂ عشق ملاحظہ فرمائیں۔ کہتے ہیں۔

آج مظہر سے سرِ راہ ملاقات ہوئی
آج ہم نے بھی سگِ کوئے مدینہ دیکھا

بلبل شیراز حافظ شیراز کی نوائے شوق سنیے۔عرض کناں ہیں۔

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ بربندی
چرا بگردنِ حافظؔ نمے کند رسنے

آقا! سنا ہے کہ آپ اپنے کتوں کے گلے میں پٹہ ڈال کے رکھتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے بے چارے حافظؔ کی گردن میں رسی کیوں نہیں ڈالتے۔

ساتویں علامتِ محبت حضور، پرنور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے محبت کرنے والوں کی محبت ہے، اور آقائے دوجہاں علیہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلام کے ساتھ بغض رکھنے والوں اور آپ کی گستاخی اور توہین کرنیوالوں سے نفرت ہے۔اس علامتِ محبت کو قرآنِ حکیم یوں بیان کرتا ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْماً یُؤمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَ ادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰہَ وَرَسُوْ لَہٗ وَلَو کَانُوْ ابآ ءَ ھُمْ اَوابْنَاءَ ھُمْ اَوْاِخْوَانَھُمْ اَو عَشِیْرَ تَھُمْ۔

ترجمہ: تو نہ پائے گا انہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ اور قیامت پر کہ ان کے دل میں ایسوں کی محبت آنے پائے جنھوں نے خدا اور رسول کی مخالفت کی چاہے وہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔

کیونکہ ایمان والوں کی محبت بھی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے ہوتی ہے اور نفرت بھی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے ہوتی ہے۔ایک غزوہ میں صحابیِ رسول حضرت ابوعبیدہؓ ایک کافر کا سر کاٹ کر لاتے ہیں اور حضور علیہ الصلوۃ کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں۔آقا پوچھتے ہیں ابوعبیدہؓ یہ کس کا سر کاٹ لائے ہو۔عرض کرتے یارسول اللہ ﷺ قسم ہے رب کعبہ کی اپنے سگے باپ کا سر کاٹ لایا ہوں۔

دوستو! ذرا عالمِ تصورات میں حضرت ابوعبیدہؓ سے سوال تو کرو کہ اے عاشق رسول کیا آپ کے ہاتھ نہیں کانپتے تھے۔ وہ فرمائیں گے اگر نسبتِ پدری پیشِ نظر ہوتی تو شاید ہاتھ کانپ جاتے مگر ہم اصحابِ رسول غزوات میں سر کاٹتے وقت نسبتِ پدری و پسری نہیں بلکہ نسبتِ محمد دیکھتے تھے جو حضور کا غلام ہے۔ وہ ہمارا امام ہے اور جو ہمارے محبوب کا غلام نہیں ہے وہ ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔

محمد مصطفیٰ ہیں عالمِ ایجاد سے پیارے

پدر مادر برادر جان اولاد سے پیارے

ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے عرض کی ابا جان! آپ اسلام قبول کر چکے تھے اور میں نے ابھی قبول نہیں کیا تھا کہ ایک جنگ میں آپ میری تلوار کے نیچے آگئے تھے مگر میں نے آپ کو اپنا والد گرامی سمجھ کر چھوڑ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ بیٹا رب کی عزت کی قسم! اگر تو میری تلوار کے زد میں آجاتا تو تیرا سر قلم کر دیتا۔ میں یہ نہ دیکھتا کہ تو میرا بیٹا ہے بلکہ یہ دیکھتا کہ تو میرے محبوب کا دشمن ہے۔

آٹھویں علامتِ محبت، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کی محبت ہے۔ کیونکہ آقا علیہ السلام کو اپنی امت سے بڑی محبت تھی ہر وقت امت کی بہتری اور بھلائی کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ کفار کے ظلم وستم برداشت کیے تو امت کے لیے۔ بازارِ طائف میں پتھر کھائے تو امت کے لیے۔ امت کے غم میں کبھی غاروں میں جا کر روئے اور کبھی جنت البقیع میں آنسو بہائے جب اس دنیا من تشریف لائے تو اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّتِی کی صدائے دلگداز زبانِ مقدس پر تھی کہ یا اللہ میری امت کے گناہ معارف فرما اور جب اس دنیا سے گئے تو اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّتِی کی دُعا فرما رہے تھے۔ جو شخص حضور علیہ الصلوٰۃ سے محبت کرتا ہے وہ آپ کی امت سے بھی محبت کرتا ہے۔ اور آپ کی امت سے محبت کا معنی یہ ہے کہ آپ کی امت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ افرادِ اُمت کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ اور ان کی بھلائی اور بہتری کا کوئی دقیقہ فردگزاشت نہ کرے۔ اگر وہ جج ہے تو انھیں انصاف فراہم کرے۔ اگر وہ معلم ہے تو انھیں زیورِ تعلیم سے آراستہ

کرے۔ اگر وہ حاکم ہے تو انھیں جان و مال و عزت و آبرو کا تحفظ عطا کرے اور اگر وہ صاحب ثروت ہے تو ان کی کھانے پینے اور رہنے سہنے کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ الغرض جس شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہے اس شعبے میں ان کی ہر طرح کی امداد و اعانت کا حق ادا کرتا رہے۔

نویں علامتِ محبت، فقر محمدی کی محبت ہے۔ حضور رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ فقر میرا سرمایہ افتخار ہے۔ قربان جائیں فقر آپ کو کتنا محبوب تھا حالانکہ آپ روح ایمان بھی ہیں۔ جانِ دو جہان بھی ہیں۔ سراپا قرآن بھی ہیں۔ خاتم النبین بھی ہیں۔ امام الاولین و الآخرین بھی ہیں۔ سید الانبیاء والمرسلین بھی ہیں۔ باعثِ تخلیقِ کائنات بھی ہیں اور حبیبِ ربِ کائنات بھی ہیں۔ کتنی عظمتوں کے حامل ہیں۔ کیسی رفعتوں کے مالک ہیں مگر فخر اِن مناصبِ جلیلہ پر نہیں۔ ان درجات عالیا پر نہیں۔ اگر فخر ہے تو اس شانِ فقر پر فخر ہے جس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ سید الملائکہ جبریل امین پائے مقدس کے بوسے لیتا ہے تو اس وقت اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی مسرت بلالؓ و صہیبؓ و سلمانؓ کو سینے سے لگا کے ہوتی ہے۔ اَفْضَلُ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِیِّیْنَ حضرت ابوبکر صدیقؓ شبِ ہجرت کاندھوں پہ اٹھالیں تو اس وقت اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی خوشی ایک غریب بڑھیا کی گٹھڑی سرِ اقدس پہ اٹھا کے ہوتی ہے۔ نعلینِ پاک خاک آلودہ ہوں جبریل جنت سے جوڑا لے آئیں تو اس وقت اتنی فرحت نہیں ہوتی جتنی فرحت اپنے ٹوٹے ہوئے نعلینِ مقدس کو اپنے دستِ مبارک سے مرمت کر کے ہوتی ہے۔

کشتہ عشقِ مصطفیٰ امام احمد رضاؒ نے کیا خوب فرمایا۔

کُل جہاں تک مُلک اور جَو کی روٹی غذا
اس شکم کی قناعت پر لاکھوں سلام

اس حقیقت کو کسی نے یوں بیان کیا ہے۔

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پہ پتھر بندھے ہیں

کسریٰ کا تاج روندے ہوئے پاؤں تلے
اور بوریا کھجور کا گھر میں بچھا ہوا

حضور سرورِ عالم ﷺ اکثر یہ دعا فرمایا کرتے تھے

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْناً وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْناً وَحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنَ۔

ترجمہ: اے اللہ مجھے فقیری کی زندگی عطا فرما۔ فقیری کا وصال عطا فرما اور گروہ فقرا میں ہی میرا حشر فرما۔

تو جو شخص حضور ﷺ سے محبت کرے گا۔ وہ فقر، فقیری اور فقرا کو ہمیشہ محبوب رکھے گا، کیونکہ یہ وہ چیز ہے جو آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پسند تھی۔ اسی کو پسند کرنے میں اور اسی کو اپنانے میں ہماری نجات ہے جو لوگ فقر کو پسند کرتے ہیں اور فقر کے راستے پر چلتے ہیں وہ لوگ تکبر و نخوت اور فخر و غرور کے تصور سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ جہاں فقر ہو وہاں تکبر راہ نہیں پا سکتا۔ فقر کا راستہ ایمان کی سلامتی کا راستہ ہے اور تکبر کا راستہ بربادی کا راستہ ہے۔ یہ تکبر ہی تھا جس نے معلم الملکوت عزازیل کو شیطان بنا کر ہمیشہ کے لیے لعنتوں کے قعرِ مذلت میں گرا دیا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ہم جس فقر کی بات کر رہے ہیں یہ فقر اضطراری نہیں، اختیاری ہوتا ہے۔ اس فقر کو مجبور ہو کے نہیں مسرور ہو کے اپنایا جاتا ہے۔

دسویں علامتِ محبت، قرآن کی محبت ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے قلبِ منیر پر نازل ہوئی۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے جو اسوۂ حسنہ مصطفیٰ ہے یہ وہ دستور زندگی ہے جو سیرت مصطفیٰ ہے، یہ وہ دیوانِ محبت ہے جو نعتِ مصطفیٰ ہے اور یہ وہ بیاضِ عشق ہے جو ذکرِ مصطفیٰ ہے اس کی سورۂ مومنون کی تلاوت کریں تو عاشقانِ مصطفیٰ کا سراپا دکھائی دیتا ہے اور اس کی سورۂ منافقون پڑھیں تو گستاخانِ مصطفیٰ کی منحوس صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس کی سورۂ نور کی تلاوت کریں تو ازواجِ رسول کی عظمت دکھائی دیتی ہے اور اس کی سورۃ حجرات پڑھیں تو آداب رسول کی اہمیت نظر آتی ہے۔ اس کی سورۂ مزمل کی تلاوت کریں تو محبوب کے وجودِ مقدس پر کالی کملی

نظر آتی ہے اور اس کی سورۂ مدثر پڑھیں تو پیارا چادر رحمت میں لپٹا دکھائی دیتا ہے۔اس کی سورۂ بلد کی تلاوت کریں تو شہر محبوب نظر آتا ہے اور اس کی سورۂ کوثر پڑھیں تو مقام محبوب دکھائی دیتا ہے۔ اس کی سورۂ عصر کی تلاوت کریں تو زمانہ نبوی نگاہوں میں آتا ہے اور اگر اس کی سورۂ والضحیٰ کی تلاوت کریں تو جلوۂ محمدی دکھائی دیتا ہے۔

صَلیَّ اللّٰہُ عَلٰی النَّبِیِّ الْاُمِیِّ وَاٰلِہٖ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسلَّمَ صَلٰوۃً وَّسَلَاماً عَلَیکَ یَارَسُولَ اللّٰہ.

دوستانِ گرامی! کیسے ممکن ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ سے محبت کرنے والے آپ پر نازل ہونے والی کتاب سے محبت نہ کریں مگر قرآنِ حکیم سے محبت کا معنی فقط یہ نہیں کہ اسے مخملی غلاف میں لپیٹ کر اور چوم کر بلند جگہ پر سجا دیا جائے یا کسی کے ہاتھ میں ہو تو اس کی طرف پشت نہ کی جائے۔ یہ تمام آداب اپنی جگہ مگر اس کے ساتھ سچی محبت کرنے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو زندگی بھر نہ تو اس کی طرف اپنے وجود کی پشت کرتے ہیں جنھیں قرآنِ حکیم سے حقیقی محبت ہوتی ہے۔وہ اس کی تلاوت فقط کسی مرحوم کے ایصالِ ثواب کے موقع پر ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے قلوب کو مرنے سے بچانے کے لیے وہ روزانہ اس کی تلاوت کو اپنی پاکیزہ عادت بنا لیتے ہیں وہ فقط اپنے بینائی سے محروم اور معذور بچوں کو ہی اسلامی مدارس میں دین و قرآن سیکھنے کے لیے نہیں بھیجتے بلکہ اپنے سالم الوجود اور کامل الاعضاء سپوتوں کو بھی دین محمدی کی خدمت اور کتابِ محمدی کی حفاظت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ان کے دور میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزی تہذیب اور مغربی کلچر سیکھنے والے تو اعلیٰ ہوسٹلوں میں رہیں اور رنگ رنگ کے کھانے کھائیں مگر دینِ محمدی سیکھنے والے ٹوٹے ہوئے حجروں اور پھٹی ہوئی چٹائیوں پر وقت گذاریں اور صبح و شام چھابڑی اٹھا کر محلے کے ایک ایک دروازے پر بھیک مانگتے نظر آئیں۔

مسلمانو! اگر تمھیں قرآن اور صاحب قرآن سے سچی محبت ہے تو پھر اس فرسودہ نظامِ تعلیم و تربیت کو بدلنا ہوگا۔اور اس بے ہودہ طریق زندگی کو تبدیل کرنا ہوگا۔

قارئینِ کرام! ہم نے جو دس علامات شرائط وشواہدِ محبت بیان کیے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات والا صفات سے محبت سرے سے ثابت نہیں ہوگی یا ثابت ہو جائے گی مگر ناقص قرار پائے گی۔ اگر کسی کے دل میں ادب و تعظیم رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاکیزہ جذبات تو موجود ہیں مگر اطاعت میں کمی ہے، اتباع میں کمی ہے تو ایمان ثابت ہو جائے گا مگر ناقص رہے گا۔ جیسا کہ آقا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُ حَتّٰی یَکُوْدَ هَوَاهُ تَبْعًا لَمَّا جِئْتُ بِهٖ ۔تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں بن سکتا جب تک اس کی خواہشات اس چیز کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لایا ہوں۔ یہاں کمالِ ایمان کو اپنی اتباع پر موقوف قرار دیا لیکن دوسری جگہ ارشاد فرمایا لَا یُؤْمِنُ اَحَدُ کُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِمِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْن ۔یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والدین، اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔ یہاں ثبوتِ ایمان اور اثباتِ ایمان کو ذاتِ گرامی سے، سب سے بڑھ کر محبت پر موقوف قرار دیا۔

معلوم ہوا کہ کمالِ ایمان کے لیے کمالِ محبت کا ہونا ضروری ہے۔ اور کمالِ محبت کے لیے شرائط وشواہدِ محبت کا ہونا ضروری ہے۔ جس کے دل میں رحمتِ کائنات ﷺ کی مطلق محبت نہیں اس کے دل میں مطلق ایمان نہیں۔ اگر محبت ہے تو ایمان ثابت تو ہوگا لیکن کمالِ ایمان شرائطِ محبت کو پورا نہ کرنے سے بدنصیب ہوگا۔ اس مضمون محبت کو ایک اور انداز کے ساتھ حضرت سھل بن عبداللہؓ یوں بیان کرتے ہیں:

عَلَامَةُ حُبِّ اللّٰهِ حُبُّ الْقُرْاٰنِ وَعَلَامَةُ حَبِّ الْقُرْاٰنِ النَّبِیَّ وَعَلَامَةُ حُبِّ النَّبِیِّ حُبُّ السُّنَّةِ وَعَلَامَةُ حُبِّ الْاٰخِرَةِ وَعَلَامَةُ حُبِّ الْاٰخِرَةِ بُغْضُ الدُّنْیَا وَ عَلَامَةُ بغضِ الدُّنْیَا اَنْ لَا یُدَّ خِرَ اِلَّا زَادً وَّبُلْغَةً اِلَی الْاٰخِرَةِ (کتاب الشفاء)

ترجمہ: اللہ پاک کی محبت کی علامت اور پہچان قرآن حکیم کی محبت ہے اور قرآن کی محبت کی علامت

نبی اکرم ﷺ کی محبت ہے اور حضور علیہ السلام محبت کی پہچان اور علامت آپ کی سنت کی محبت ہے۔ اور آپ کی سنتِ مطہرۃ سے محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی علامت دنیا کی نفرت ہے اور دنیا سے نفرت کی علامت یہ ہے کہ آخرت کے لیے زادِ راہ اور توشہ عمل کی پونجی کے سوا کچھ جمع نہ کیا جائے۔

دوستانِ گرامی! آیئے ایک لمحہ کے لیے ان علامات وشرائطِ محبت کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم حضور رحمتِ عالم ﷺ کی محبت کے کس درجے پر کھڑے ہیں اور ہماری سیرت وکردار میں آپ ﷺ کی محبت کے کتنے رنگ نمایاں ہیں۔

خدا کرے کہ ہم محبتِ رسول علیہ الصلوۃ والسلام اور اس کے تقاضوں اور شرائط وآداب کو سمجھ جائیں اور انھیں پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش اور بھرپور جدوجہد کریں۔ یہی جذبہ اور نیت اس تحریر کی محرک ہے ورنہ

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

مثنوی رومی کا حکمت آموز اسلوب

______ پروفیسر محمد نصر اللہ معینی ☆

سیدنا حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ اسلام کے مطابق دوزخ میں سزا پانے والے کا جب چمڑا جل جائے گا تو اس کے جسم کو اس کی جگہ ہر بار ایک نیا چمڑا پہنا دیا جائے گا، تا کہ وہ بار بار عذاب کا مزہ چکھتا رہے۔ میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ یہ دوسرا نیا چمڑا پہلے چمڑے کا عین ہے یا غیر؟

سوال کرنے والا یہ شخص دہریہ تھا اور یومِ جزا و سزا کا قائل نہیں تھا۔ وہ اپنی بحث کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اگر وہ عین پہلے والا چمڑا ہے تو وہ جل چکا ہے اور اگر غیر (دوسرا) ہے تو اس دوسرے چمڑے کا کیا قصور اسے کیوں جلایا جائے گا۔

حضرت امام عالی مقام نے فرمایا: وہ چمڑا ایک لحاظ سے پہلے والا بھی ہے اور ایک پہلو سے یہ اس کا غیر بھی ہے۔

سوال کرنے والا حضرت کے اس جواب سے مطمئن نہ ہو سکا تو آپ نے ایک مثال دے کر اسے بات سمجھانے کی کوشش کی۔ فرمایا دیکھو ایک پرانی اینٹ کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے پھر اس کی خاک کو بھگو کر نئی اینٹ بنالی جائے تو اب یہ اینٹ ایک لحاظ سے پہلے والی اینٹ ہے اور دوسرے پہلو سے یہ بالکل ایک نئی اینٹ ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؒ کی اس تمثیل نے سائل کے ذہن کا بند دریچہ کھول دیا۔ وہ بات جو فلسفہ کی کتابوں سے حل نہ ہو سکی ایک چھوٹی سی مثال نے حل کر دی۔

تمثیل سے (مثال دے کر) بات سمجھانا قدیم ادوار سے اہلِ علم اور اصحابِ فکر و دانش کا معمول رہا ہے۔ تشبیہ اور مثال سے سمجھانے کا انداز بڑا موثر اور افادیت کا حامل ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایک مثال افہام و تفہیم کے راستے کو بہت مختصر کر دیتی ہے۔ اس سے کہنے اور سننے والے،

☆ ڈائریکٹر ریسرچ: منہاج یونیورسٹی۔ لاہور

دونوں فلسفیانہ استدلال کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔اہل علم اور سلیم الفکر لوگوں بلکہ عام سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے یہ مثالیں چراغ راہ کا کام دیتی ہیں۔

دینی اور اخلاقی تعلیمات میں یہ اندازِ بیاں خاص اہمیت رکھتا ہے۔مؤثر اور دل پذیر ہونے کی بنا پر تمام کتب سماوی میں اس انداز کو استعمال کیا گیا ہے۔قرآن مجید نے بھی سمجھانے کے اس بلیغ ترین ذریعے کو اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔چنانچہ رب العزت فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَاالْقُرآنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ (سورۃالروم:۵۸)

ترجمہ: ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں۔

قرآنِ مجید میں دی گئی ان مثالوں کا یہاں ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔انھیں قرآنِ مجید میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔مثالیں بیان کرنے کی حکمتیں یہ بیان فرمائی گئی ہیں۔

ا۔وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْامثالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ۔

ترجمہ:اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں اس لیے بیان کرتا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

ب ۔وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ۔

ترجمہ:اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور وفکر کریں۔

حقائق کو واضح کرنے،مطالب کو دلنشین بنانے اور غور وفکر کی دعوت دینے کے لیے قرآن مجید میں جتنی بھی مثالیں بیان کی جاتی ہیں،ان کی اثر آفرینی نا قابلِ تردید ہے۔یہ مثالیں جہاں اہلِ یقین کے اطمینان میں اضافہ کرتی ہیں وہاں مخالفین کی زبانیں بھی گنگ ہو جاتی ہیں۔

الغرض تمثیل اور تشبیہ کے ذریعے بات سمجھانا سنتِ الٰہی ہے اسے قرآنِ مجید کے علاوہ دیگر کتب سماوی میں بھی استعمال کیا گیا اس سنتِ الٰہی کو سیدِ دو عالم فخرِ بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی گفتگو میں اختیار فرمایا۔چنانچہ ذخیرۂ احادیث میں بے شمار تمثیلات اور تشبیہات موجود ہیں جو اہلِ ایمان اور اہلِ فکر کے لئے چراغِ راہ ہیں۔

انبیاء کے بعد اولیا،حکما اور صالحین نے بھی اسی اندازِ بیان کو اختیار کیا۔ان کی کتب میں بکثرت تمثیلات وتشبیہات ملتی ہیں۔صوفیاء کو اپنی بات سمجھانے کے لئے تمثیل،تشبیہ اور استعارہ کا سہارا اس لیے لینا پڑا کہ خالص معرفت کی باتیں اور اسرار وحقائق اگر براہِ راست بیان کیے جائیں

تو عوام الناس انھیں سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور جو بات سمجھ نہ آئے اس پر اعتماد اور یقین کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ صوفیا متقدمین تمثیلات وتشبیہات کا سہارا لے کر اپنی باتیں سمجھاتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''مثنوی'' میں اکثر تمثیلات اور تشبیہات کے ذریعے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ عوام چونکہ حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں اور براہِ راست حقائق واسرار کے ادراک وفہم سے قاصر ہوتے ہیں اس لیے انھیں بات سمجھانے کے لیے مثالیں گھڑنی پڑتی ہیں خواہ ان کا حقیقتِ واقعہ سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں ایسی ہی صورتِ حال سے علمِ نحو کے ایک معلم کو واسطہ پڑا تو اسے بھی بات گھڑے بغیر چارہ نہ رہا۔ واقعہ یوں ہوا کہ علمِ نحو کے ایک معلم نے جب طلبا کو پڑھایا کہ زَیْدٌ قَد ضَرَبَ عَمرواً یعنی زید نے عمرو کو مارا تو طلبا حیران ہو کر اپنے استادِ گرامی سے پوچھنے لگے کہ زید نے عمرو کو کیوں مارا؟ اس کا قصور کیا تھا؟ معلم نے کہا بچو میں تمھیں فاعل اور مفعول کا اعراب سمجھانے کے لیے ایک مثال دے رہا ہوں۔ اس پر جھگڑالو بچے کہنے لگے کہ نہیں جناب! آپ ہمیں بتایئے کہ زید نے عمرو کو کس قصور کی بنا پر مارا؟

معلم نے تنگ آ کر کہا عمرو اصل میں عمر تھا اس عمر نے ایک واؤ چرا کر اپنے ساتھ لگا لی جس کا اسے کوئی حق نہیں تھا چنانچہ اس کی سزا میں اسے مار پڑی۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ کم فہم اور ٹیڑھی عقل والوں کو مطمئن کرنے کے لیے سیدھی کی بجائے بعض دفعہ ٹیڑھی بات کرنا پڑتی ہے۔ جس طرح کہ ٹیڑھے پاؤں کے لیے ٹیڑھا جوتا بنانا پڑتا ہے۔ اگر سیدھا جوتا پہنایا جائے گا تو اس کے پاؤں کو تنگ کرے گا اس لیے

پائے کج را کفش می بایست کج

حضرت رومی فرماتے ہیں کہ بعض لوگ بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھانے کے لیے تمثیل اور دروغ مصلحت آمیز پر مبنی قصے سنانے پڑتے ہیں۔

عوام چونکہ افسانہ پسند ہوتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ افسانوی انداز سے بات کرنا زیادہ مؤثر ہوتا۔ چنانچہ بات کو قصوں میں گھما پھرا کر سمجھانا پڑتا ہے۔

ہر کہ او جنسِ دروغ است اے پسر

راست پیشِ او نباشد معتبر

یعنی افسانہ پسند شخص کے سامنے حقیقت نگاری معتبر نہیں ٹھہرتی۔

یہی وجہ ہے کہ تشبیہات و تمثیلات کے ساتھ ساتھ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں کئی مقامات پر افسانوی انداز میں حکمت آموز قصے اور کہانیاں بھی بیان کی ہیں۔

ان میں کئی کہانیاں جانوروں سے متعلق ہیں۔ کئی حقائق اور دانائی کی باتیں جانوروں کی زبان سے کہلوائی گئی ہیں۔ مثلاً لومڑ نے یہ کہا، شیر نے یہ جواب دیا اور طوطے نے یہ بات کی۔ ظاہر پرست اس پر فوراً جھوٹ کا لیبل لگا دیتے ہیں لیکن درحقیقت مولانا ان باتوں سے کوئی روحانی یا اخلاقی سبق اخذ کر کے قاری کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ قصہ تو ایک پیمانے (ماپنے والے برتن) کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں دانوں کو ناپا جاتا ہے۔ خریدار کی غرض دانوں سے ہے نہ کہ اس سے کہ پیمانہ لوہے کا ہے یا تانبے اور پیتل کا؟ اور اگر چاندی کا ہے تو کیا چاندی خالص ہے یا اس کے اندر کوئی کھوٹ ہے؟ رومی فرماتے ہیں کہ حکمت آموز افسانوں کو اس نظر سے دیکھنا احمقوں کا کام ہے۔ کوئی دانش مند کسی افسانے کو تاریخی حیثیت سے بیان نہیں کرتا۔ افسانہ تو اس کے لیے صرف حکمت آموزی کا ایک آلہ ہوتا ہے۔

اے برادر قصہ چوں پیمانہ ایست

معنی اندروے مثال دانہ ایست

مولانا روم کا مقصد یہ ہے کہ تمہاری نظر پیمانے کی بجائے دانوں پر ہونی چاہیے۔ اور تمہیں حکمت کے موتی سمیٹنے کی فکر ہونی چاہیے۔ مثنوی میں حضرت رومیؒ نے کئی ایسے قصے اور کہانیاں بھی بیان کی ہیں۔ جو بظاہر نا قابل یقین دکھائی دیتی ہیں۔ تاریخی اور واقعاتی لحاظ سے ان کی صحت پر کلام کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا مقصد واقعات کو تاریخی لحاظ سے بیان کرنا نہیں ہوتا، نہ ہی مثنوی کوئی تاریخ کی کتاب ہے بلکہ وہ فارسی نظم میں دانش اور حکمت کے موتیوں سے لبریز کتاب ہے۔

مولانا رومؒ ایک چھوٹی سی بات کو دل پذیر بنانے کے لیے افسانوی رنگ میں بڑھاتے

چلے جاتے ہیں۔ بہت سے معاشرتی سماجی، روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کو داستان میں سمیٹ کر لوگوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز بنا دیتے ہیں۔ اور یوں حکمت کے بے شمار موتی قاری کے دامن میں ڈال دیتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب ''تشبیہاتِ رومی'' میں لکھتے ہیں۔

''مولانا کا مقصد حقیقی شاعری ہے نہ قصہ گوئی، وہ حکمت کے موتیوں کو نہایت معمولی سیپیوں میں سے نکالتے ہیں عوام کے ذوق کی خاطر ان کے قصوں میں اکثر اوقات اِدھر اُدھر بھوسا پھیلا ہوا نظر آتا ہے لیکن تلاش کرنے والے کو اس بھوسے کے اندر ایسے دانے ملتے ہیں جو مردِ حکیم کے لیے حکمت کا سرمایہ اور عارف کے لیے روح کی غذا ہیں (تشبیہاتِ رومی ص:۲۰۹)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی بات اپنی جگہ بڑی اہم اور بڑا وزن رکھتی ہے۔ یقیناً ان قیمتی دانوں کی یافت سے وہی لوگ سرفراز ہوتے ہیں جو مردِ حکیم (دانا) ہیں یا عارف ہیں اور معرفت کے اسرار و رموز سے آگاہی رکھتے ہیں لیکن دوسری طرف مولانا رومؒ کے دور سے لے کر اب تک ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی جن کا دانش اور معرفت کے کوچوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ کم عقلی یا تعصب کی بنا پر ان کی نظر ہمیشہ بھوسے پر رہی ہے اور ان میں چھپے حکمت کے دانے انھیں نظر نہیں آتے۔ مولانا روم اور ان کی شاہکار کتاب ''مثنوی'' کا حوالہ دیکھتے ہی یہ لوگ دشنام طرازی اور الزام تراشی پر اتر آتے ہیں۔ اور اسے اسلام کے خلاف ثابت کرنے میں اپنی ہمتیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی ایسی کئی تحریریں راقم معیّنی کی نظر سے گذری ہیں جنھیں دیکھ کر بقول شاعر:

بریں عقل و دانش بباید گریست

ان کی ایسی عقل و دانش پر رونا آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تنگ نظری، ہٹ دھرمی اور تعصب پسندی کی ان مسموم فضاؤں سے دور بہت دور ایک مردِ دانا کے کانوں میں رس گھولتی اور روح کو وجد میں لاتی آواز آتی ہے۔ تو ان لوگوں کے نفرت پر مبنی استدلال تنکوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔

گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر　　از اب و جد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست　　　پائے او محکم فتد در کوئے دوست

یعنی اگر تجھے کسی مردِ حق آگاہ کی صحبت میسر نہیں آئی تو مجھے اپنے آباؤ واجداد سے جو نصیحت ملی ہے وہ تم بھی حاصل کرلو (وہ یہ کہ) حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا رفیقِ راہ بنالو تا کہ خدا تعالیٰ تجھے سوز وگداز کی دولت عطا فرما دے۔

کیونکہ پیرِ رومی پلکوں سے مغز تک پہنچنے کا راستہ جانتے ہیں یعنی ظاہر و باطن کے اسرار سے آگاہ ہیں اور کوئے یار میں ثابت قدمی سے گذر رکھتے ہیں۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ جہاں پیرِ رومی کو رفیقِ راہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں وہاں خود بھی اس مردِ حکیم کے افکار سے خوشہ چینی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔"جاوید نامہ" مولانا روم سے محبت کی ایک زندہ مثال ہے۔اقبال اپنے کلام میں جا بجا پیرِ رومی سے رہنمائی حاصل کرنے کا اعتراف کرتے ہیں ۔اقبالؒ کی مولانا روم سے قلبی محبت اور الفت اور ان سے استفادہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے جسے کسی اور شمارے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

الغرض مثنوی مولانا رومؒ وہ بے مثال اور شاہکار کتاب ہے جو حقائق اور معارف کو آسان اور دلنشین انداز میں بیان کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتی یہی وجہ ہے کہ علما وفضلا اور خطبا کے ہاں جتنی پذیرائی مثنوی کو ملی ،اتنی شاعری کی کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔عوام الناس تو مثنوی مولوی ومعنوی ہست قرآن درزبان پہلوی کہتے چلے آئے ہیں کیونکہ اس میں عقائدِ اسلام اور حقائق ومعارف کو بڑے دلنشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

مولانا رومؒ سے لے کر ہر دور میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی جو اپنی آواز کا جادو جگاتے ہوئے مثنوی کے اشعار لوگوں کے قلب وروح میں اتارتے اور انھیں وجد میں لاتے رہے ہیں۔حضرت رومی کے کلام کی تاثیر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فارسی زبان کو نہ سمجھنے والے بھی اس پر سر دھنتے دکھائی دیتے ہیں۔مثنوی کو یہ فیض قرآنی حقائق اپنے اندر سمونے کی وجہ سے ملا۔پروفیسر اوزلوک کی روایت کے مطابق ترکی میں لوگ مثنوی پڑھتے وقت آغاز میں یہ شعر پڑھتے ہیں۔

این چنیں فرمود مولانائے ما

کاشفِ اسرار وحی کبریا

خواجہ محمد سلیمان تونسوی کے مجموعہ ہائے ملفوظات کا تعارفی مطالعہ

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر☆

ملفوظات: روحانیت، روایت، تہذیب اور تہذیبی زندگی کی کوکھ سے پھوٹنے والی وہ صنفِ ادب ہے، جس میں قرونِ وسطیٰ کا پورا معاشرہ سانس لیتا تھا۔ بادشاہوں کے سیاسی اور سماجی جبر کے مظاہر بھی اس میں منعکس ہوتے تھے اور عوام کے دکھوں کے مناظر بھی۔ اس صنفِ ادب میں گیرائی بھی تھی اور گہرائی بھی۔ اس میں فکر و خیال کی جلوہ گری بھی تھی اور شعر و ادب کی جلوہ آرائی بھی۔ اس میں رنگ بھی تھے اور بے رنگی بھی۔ کتنے ہی زمانوں کی دانش اس کے منظر نامے سے منکشف تھی اور کتنے ہی صاحبانِ کشف کا وجدانی تجربہ اس کے آنگن میں جلوہ نما تھا۔ اس کے برعکس بادشاہوں کے درباروں میں لکھی جانے والی تاریخ: عوام اور عوامی زندگی کے مختلف اور متنوع رنگوں کی جمالیات کی امین نہیں تھی، کیونکہ درباداری اور اس کے مظاہر میں عوام کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ یوں اس معاشرے میں عوام: خانقاہی نظام کی اس زندہ روایت سے جڑے ہوئے تھے، جس میں انھیں بنیادی اور اساسی اہمیت حاصل تھی۔ ملفوظات کا معنوی منظر نامہ بھی عوام کی جذباتی زندگی اور اس کی تہذیب سے وابستہ تھا، جس میں وہ زندہ تھے۔ اسی لیے اس میں عام آدمی کے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں اور اس کی زندگی کے دکھ سکھ بھی اس کے بین السطور اپنی چھب دکھاتے ہیں۔ عوامی زندگی کی جتنی تصویریں ملفوظات کے آئینہ خانے میں منکشف ہوئی ہیں، اتنے تواتر، تسلسل اور عمدگی کے ساتھ ان کی عکس گری کسی بھی دوسری صنفِ ادب میں نہیں ہوئی۔ ملفوظات میں تہذیبی زندگی کے رنگ بھی ہیں اور سماجی زندگی کے مظاہر بھی۔ اس میں ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور تاریخ کی عمل داری بھی۔ اس میں کہانی کی آمیزش بھی ہوتی اور تمثیل کی خوشبو بھی۔ اس صنفِ اظہار میں صداقتِ احساس کے وہ چراغ روشن ہیں،

☆ صدر شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

جن کی لوز مانوں کو جگمگا رہی ہے۔

سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ اور روایت میں حضرت نظام الدین اولیاؒ (م ۷۲۵ھ) کے کئی مجموعہ ہائے ملفوظات مرتب ہوئے۔ ان میں سے کچھ مجموعے عدم کے طلسمات میں گم ہو گئے اور اب محض ان کے نام ہی محفوظ رہ گئے، یا تصوف و عرفان کی کتابوں میں ان کے اکا دکا اقتباسات ہی نظر نواز ہوتے ہیں اور یہ کہیں بھی مکمل صورت میں دستیاب اور محفوظ نہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے بعد سب سے زیادہ ملفوظات حضرت محمد سلیمان خان تونسوی المعروف خواجہ پیر پٹھان (م ۱۲۶۷ھ) کے قلم بند ہوئے اور ان کا فکری اور عرفانی دائرۂ اثر اس قدر وسعت آشنا ہوا کہ چشت کے تمام مراکز کے سجادہ نشینان، یا ان کے خلفاً کے حلقۂ غلامی میں بندھ گئے اور یوں دبستانِ تونسہ کا علمی اور عرفانی اثر کئی علاقوں تک پھیل گیا۔

ذیل میں ان کے مجموعہ ہائے ملفوظات کا ایک تعارفی جائزہ ہدیۂ قارئین ہے:

[۱]

نافع السالکین خواجہ محمد سلیمان تونسوی کے ملفوظاتِ عالیہ کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب اور جامع مولوی امام الدین ہیں۔ مولوی صاحب موصوف خواجہ سلیمان تونسوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے عالم اور دانا انسان تھے، لیکن افسوس کہ چشت کے معاصر تذکرے اُن کے ذکرِ خیر سے خالی ہیں۔ وہ کب پیدا ہوئے اور انھوں نے کب اور کہاں وفات پائی؟ کچھ معلوم نہیں۔ مولوی امام الدین کو مدتوں اپنے پیر و مرشد کی بارگاہِ تقدس مآب میں ناصیہ فرسائی کی سعادت حاصل رہی اور وہ اس زمانے میں ان مجالس کی روداد نویسی میں منہمک رہے، جو تونسہ مقدسہ کی پُرخلوص اور علم پرور فضا میں انعقاد پذیر ہوئیں۔

نافع السالکین خواجہ سلیمان تونسوی کے دیگر مجموعہ ہائے ملفوظات میں منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ یہ مجموعہ فارسی زبان میں ہے اور دو بار اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اولاً اس مجموعے کی اشاعت کی سعادت منشی محمد منیر کے حصے میں آئی، جنھوں نے حافظ عزیز الدین کی فرمائش پر اسے

اپنے پریس (ہوپ پریس، لاہور) سے ۱۲۸۵ھ میں اشاعت آشنا کیا اور یوں یہ دُرِ بے بہا تو نسہ مقدسہ کی عارفانہ تجلیات کا لبادہ اوڑھ کر عشق اور معرفت کی کیفیات کا ترجمان ہوا۔ اس مجموعے کی کتابت کے فرائض محمد فضیل لودھی نے انجام دیئے۔ یہ مجموعہ ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

ثانیاً یہ مجموعہ حافظ عزیز الدین نے ۱۸۹۲ء/۱۳۱۰ھ میں مطبع مرتضوی، دہلی سے شائع کیا۔ اس کے صفحات ۱۶۰ ہیں۔ اس کی کتابت محمد ظریف ڈوگرانوالہ نے کی۔ حافظ عمر دراز نے قطعۂ تاریخ کہا:

طبع این ملفوظ مطبوع جہانی اوفتاد
ھر کہ دیدش یافت در کف گوھر درج مراد
گفت فانض سال طبع دل کش از روی کمال
گوھرِ دریای معنی مخزنِ گنج سداد

ڈاکٹر محمد حسین للّٰہی نے **تذکرۂ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی** کے عنوان سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، جو اشرف پریس، لاہور سے شائع ہوا۔ سنۂ اشاعت مذکور نہیں۔ البتہ مترجم نے اپنے دیباچے کے آخر میں رجب ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء کی تاریخ رقم کی ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۳۷۶ ہے۔ ترجمہ ۳۶۸ صفحات کو محیط ہے۔ ۳۶۹ سے ۳۷۴ تک پانچ صفحات خواجہ فیض بخش للّٰہی کے احوال و آثار پر مشتمل ہیں، جبکہ آخری دو صفحات پر مختلف کتابوں کی فہرست دی گئی ہے، جو شعاعِ ادب، لاہور کے زیرِ اہتمام مطبوع ہوئیں۔

ڈاکٹر محمد حسین للّٰہی نے مولوی امام الدین کو پاک پتنی لکھا ہے، جبکہ وہ خود اپنے آپ کو بستی شاہ اعظم (ریاست بہاولپور) کا باشندہ بتاتے ہیں۔ مرتبِ ملفوظات نے کتاب کے آخر میں اپنا تعارف یوں کرایا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

"امام الدین ولد میاں تاج محمود خلف میاں حافظ
شرف الدین متوطن شاہ اعظم غفراللہ لہم"۔

مناقب شریف (مناقب سلیمانیہ) حافظ احمد یار پاک پتنی کا مرتبہ مجموعۂ احوال و ملفوظات ہے۔ حافظ صاحب ۱۲۳۵ھ میں خواجہ پیر پٹھان کی غلامی میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے پیر و مرشد کی پُر انوار زندگی کے ضیا بار لمحوں کی عکس گری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ انھیں جب بھی موقع ملا، وہ تونسہ مقدسہ کی خوش آثار فضا میں سانس لیتے رہے اور غریب نواز کی عنبر فشاں گفتار کے رنگ ان کے تخلیقی وجدان کا حصہ بنتے گئے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا، اسے اپنے مجموعے کے خوش رنگ مناظر میں سمودیا۔ حافظ صاحب کی جزئیات نگاری: کلیات کا پیکر اوڑھتی رہی اور یوں یہ عطر بیز اور مشکبار مجموعۂ ملفوظات معرضِ وجود میں آیا۔

مناقب شریف احوال و آثار اور ملفوظات و فرمودات کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جو ملفوظاتی ادب کی تاریخ میں کئی حوالوں سے منفرد اور ممتاز رویوں کا حامل ہے۔ اس مجموعے میں سوانحی رنگ بھی ہیں اور حسنِ گفتار کی خوشبو بھی؛ اس میں تاریخی احوال بھی ہیں اور زمانی واقعات بھی؛ اس میں کتابوں کا تذکرہ بھی ہے اور علمی حوالے بھی؛ اس میں مکتوبات بھی ہیں اور اوراد و وظائف بھی؛ اس میں تجربے کی رعنائی بھی ہے اور مشاہدے کی زیبائی بھی۔۔۔۔ دراصل یہ مجموعہ حافظ احمد یار کے ظاہری اور باطنی سفر کا پیش نامہ ہے۔ زمینی اور زمانی حوالے سے یہ سفر بتیس برسوں کو محیط ہے، لیکن روحانی اور باطنی رنگ میں اس سفر کا دائرہ صدیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ سفر پاک پتن شریف، احمد پور شرقیہ اور تونسہ مقدسہ کے مابین جاری رہا، لیکن اس سفر میں ازل سے ابد تک کے مناظر اپنی جھلک دکھلاتے رہے اور احمد یار اس سفر کی ابدتابی سے پیالہ گیر رہا۔

مناقب شریف میں خواجہ پیر پٹھان کے خلفا کا ذکرِ خیر بھی ہے۔ یہ مجموعہ اپنے دامن میں اتنے خلفا کے آثار کو سموئے ہوئے ہے کہ دوسرا کوئی بھی مجموعہ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ بعض خلفا کے نامِ نامی اور احوال گرامی پہلی بار اس مجموعے کی وساطت سے جلوہ گر ہوئے۔ یہ مجموعہ اس حوالے سے بھی بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ خواجہ اللہ بخش تونسوی کے حکم اور ایما پر مولانا یار محمد بندی نے اس مجموعے کی تلخیص کا کام انجام دیا۔ ملخص تو بقائے دوام کے دربار میں روشناسِ خلق

ہوا، مگر مناقب شریف کہیں طاقِ گمنامی گم ہو کر رہ گیا۔ اس کے خطی نسخے بھی کبھی عام نہیں۔ لے دے کر اس کا ایک نسخہ محفوظ رہا، جس سے وابستگانِ سلسلہ عکسی نقول بنواتے رہے۔ معلوم نہیں کہ وہ نسخہ اب کہاں ہے؟ البتہ اس کے عکس کئی احباب کے پاس موجود ہیں۔ مجھے اس کی نقل پیر محمد اجمل چشتی کے کتب خانے سے میسر آئی۔ یہ اوّل و آخر سے ناقص اور نا تمام ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آغاز میں کم وبیش دس پندرہ صفحات کم ہیں۔ آخر میں بھی اسی قدر اوراق موجود نہیں۔ ابتدائیے اور ترقیمے کی عدم موجودگی کی بنا پر کتنے ہی گوہر ہائے آبدار ہماری نظروں سے پنہاں ہو گئے۔ موجود صورت میں یہ نسخہ ۱۰۱ صفحات کو محیط ہے۔ ہر صفحے پر کم وبیش انیس بیس سطریں ہیں اور ہر سطر تیئس چوبیس الفاظ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس نسخے کے مختلف اجزا تین کاتبوں کے فنِ کتابت کے امین ہیں۔ پورا نسخہ خطِ شکستہ میں لکھا گیا ہے۔ ایک کاتب کی شکستہ نگاری کا تو یہ عالم ہے کہ اس کے لکھے ہوئے لفظ سلکِ مفہوم کی سفتہ کاری کے عمل میں ہاتھ نہیں آتے اور اُنھیں حسنِ معانی کی قطار میں گامزن رکھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ پختہ کاری اس کاتب کا حسن ضرور ہے، لیکن اس کی جنبشِ قلم سے بننے والے دائرے اور قوسیں لفظ کے عکس کو معنی کے خیال کے مدار میں لانے سے گریزاں رہتے ہیں اور یوں ان کی تفہیم کا کلی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ بقیہ دو کاتب خوش نگار ہیں۔ ان کی شکستہ نگاری الفاظ کی خواندگی میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ ان کاتبوں نے کہیں بھی اپنا نام ونشان نہیں بتایا کہ کون تھے اور کہاں بیٹھ کر اپنے فن کے اظہار میں مگن رہے؟

راحت العاشقین خواجہ پیر پٹھان غریب نواز کے احوال اور ملفوظاتِ گرامی کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مرتب میاں محمد درزی بن موسیٰ درزی ہیں۔ میاں محمد درزی (م ۱۲۹۵ھ) خواجہ غریب نواز کے مرید تھے۔ اُن کے والد بھی خواجہ کے دامن گرفتہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد میاں محمد اور اُن کے بھائی عبداللہ کی پرورش خواجہ غریب نواز کے دامنِ شفقت میں ہوئی۔ وہ ساری زندگی تونسہ مقدسہ میں رہے۔ خواجہ غریب نواز کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد مولوی محمد سرفراز فریدی اور دیگر پیر برادران کی فرمائش پر میاں محمد نے یہ کتاب تحریر فرمائی۔ حاجی

نجم الدین سلیمانی (م ۱۲۸۷ھ) مرید و خلیفہ خواجہ پیر پٹھان نے اس کتاب کا نام **راحت العاشقین** رکھا۔ مولوی محمد عمر نے اس کتاب کو **اخبار الاذکار در احوالاتِ مختار الاخیار** کے عنوان سے تعبیر کیا، جبکہ میاں محمد درزی نے اپنی تصنیفِ لطیف کو **گلشنِ اسرار** کے نام سے موسوم کیا۔

یہ مجموعۂ ملفوظات اصلاً فارسی میں ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ البتہ اس کا ایک اردو خلاصہ مولوی عنایت اللہ چکڑالوی (م ۱۹۹۳ء) نے کیا، جو ساجد نظامی کی کاوش سے نظامیہ دارالاشاعت، مکھڈ شریف کے اہتمام سے ۲۰۰۷ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اس مجموعے میں خواجہ پیر پٹھان کی مقدس زندگی کے احوال بھی ہیں اور اُن کے واقعات بھی۔ اس میں کشف و کرامت کا رنگ بھی ہے اور ملفوظات کی جمال آفرینی کا آہنگ بھی۔ ملفوظات نگاروں کے جھرمٹ میں، میاں محمد درزی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ سب سے زیادہ خواجہ پیر پٹھان کے زیرِ سایہ رہے۔ اِس قربت نے اُنھیں اپنے پیر و مرشد کے حسنِ عمل اور حُسنِ گفتار کے مظاہر اور مناظر کی عکس اندازی کا ایسا موقع فراہم کیا کہ کوئی بھی دوسرا عقیدت گزار اِس مقام اور مرتبے پر فائز نہیں ہو سکا۔

ملفوظ شریف خواجہ پیر پٹھان غریب نواز کے احوال اور ملفوظات کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مرتب مولوی غلام حیدر سکھانی ہیں۔ مولوی موصوف خواجہ کے مرید تھے۔ اب ان کی اولاد و امجاد اُنھیں خواجہ تونسوی کا خلیفہ بھی بتاتی ہے، لیکن قدیم ملفوظاتی اور سوانحی کتب میں اُن کا ذکرِ خیر کہیں بھی خلفاً کی فہرست میں نہیں ہوا۔ **ملفوظ شریف** کی ترتیب و تہذیب چار سالوں کو محیط ہے۔ بارہ رمضان المبارک ۱۲۵۶ھ کو اس مجموعے کی تحریر و تسوید کا آغاز ہوا اور پھر یہ سلسلہ ۱۲۵۹ھ تک جاری رہا۔ اس مجموعے میں ۱۲۹ مجالس کی روداد نگاری کے مناظر رقم ہوئے۔

اس مجموعے کو موضوعاتی اطوار سے تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں: خواجہ پیر پٹھان کی زندگی کے اہم تر احوال اور آثار بیان ہوئے ہیں۔

دوسرے حصے میں: تاریخ وار ملفوظات لکھے گئے، جبکہ تیسرا حصہ خواجہ غریب نواز کے

خلفاً کے بیان میں ہے۔

اِس مجموعے کا ایک مکمل ترجمہ مولوی فقیر محمود سدیدی نے کیا، لیکن متن کتاب کی طرح یہ بھی غیر مطبوعہ صورت میں منتظرِ اشاعت ہے۔

مناقبِ سلیمانی پیر پٹھان غریب نواز کے احوال اور ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے ان کے مرید اور خلیفہ غلام محمد خان نے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ دو بار چھپ چکا ہے۔ پہلی اشاعت پر سنۂ اشاعت درج نہیں۔ البتہ دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ ۱۳۱۵ھ میں شائع ہوا۔

انتخابِ گلشنِ اسرار مولوی خدا بخش چوہان کا مرتبہ مجموعۂ احوال و مناقب ہے۔ مرتب نے میاں محمد درزی کی کتاب **راحت العاشقین رگلشنِ اسرار** کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اس مجموعے کو کسی نام سے موسوم کیا اور نہ ہی بحیثیت مرتب اس مجموعے پر اپنا نام لکھا۔ مولوی چوہان خواجہ پیر پٹھان کے مرید تھے۔ وہ بستی بغلانی کے متوطن تھے۔ درس و تدریس ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ وہ ساری زندگی اس کارِ خیر میں مصروف رہے۔ وہ کاتب بھی تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کی بیسیوں کتابیں ان کے حسنِ قلم کی تابناکی کی ترجمان ہیں۔ پیشِ نظر مجموعہ مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ اس میں ملفوظات کی خوش آہنگی کا منظر نامہ صاحبِ ملفوظ کی خوش بیانی کا ترجمان ہے۔ نعیم مجددی نے فہرست سازی کرتے ہوئے اِس نسخے کا نام **منتخب الاسرار** لکھا ہے، جو درست نہیں۔ اگر اِس نسخے کو کوئی نام دینا ہو، تو **انتخابِ گلشنِ اسرار** کہا جا سکتا ہے۔ مولانا اللہ بخش رضا نے اِس مجموعے کا اردو ترجمہ بھی کیا، جو **گلشنِ اسرار** کے عنوان سے شائع ہوا، لیکن اِس ایڈیشن میں یہ غلطی در آئی کہ انھوں نے اِسے میاں محمد درزی کی تصنیف لکھا ہے۔ فاضل ترجمہ نگار کی توجہ اِس جانب مبذول نہیں ہوئی اور وہ روا روی میں اِسے **راحت العاشقین** کے مصنف سے منسوب کر گئے۔

منتخب المناقب ساتواں مجموعہ ہے۔ یار محمد ذوقی ساکن بنڈی (م ۱۳۰۵ھ) اس کے مرتب اور جامع ہیں۔ یہ مجموعۂ ملفوظات حافظ احمد یار پاک پتنی کے مرتبہ مجموعے **مناقب شریف** کے خلاصے اور تلخیص پر مشتمل ہے۔ یار محمد بن تاج محمد نے مختلف مریدوں اور نیاز مندوں کے

حوالے سے بھی کچھ ملفوظات شامل کیے ہیں، جو اصل متن پر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس مجموعے کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے، جیسے: **منتخب المناقب، انتخابِ مناقب سلیمانیہ، مناقب سلیمانیہ** وغیرہ۔ تلخیص نگار نے اس مجموعے کو متنِ کتاب میں **منتخب المناقب** کہا ہے، جبکہ سرورق پر اس کا نام **انتخابِ مناقب سلیمانیہ** لکھا گیا ہے۔ مطبوعہ ایڈیشن کے آخر میں مولوی عبد الجبار [مریدِ قبلۂ عالم پیر سید مہر علی شاہ آستانۂ عالیہ گولڑہ شریف] کی طرف سے جو اشتہار چھاپا گیا تھا، اس میں بھی اس مجموعے کا نام **انتخابِ مناقب سلیمانیہ** تحریر ہے۔ یہ مجموعہ ایک ہی بار ۱۳۲۵ھ میں لاہور سے حمیدیہ سٹیم پریس سے اشاعت آشنا ہوا۔ مولوی عبد الجبار کتاب اور اس کی اہمیت اور افادیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''کتابِ مستطاب بے نظیر و لاجواب مسمّٰی بہ **انتخابِ مناقب سلیمانیہ** علی صاحبہا الرحمۃ والتحیۃ باہزار حسنِ صوری و معنوی با فضالِ خداوندی و بہ یمنِ ایزدی حلیہ طبع و زیور انطباع سے آراستہ و پیراستہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب **مناقب سلیمانیہ** مؤلفہ حافظ احمد یار صاحب متوطن بلدۂ شریفہ پاک پتن [؟] حرسہا اللہ تعالیٰ عن الفتن کالبِ لباب و خلاصہ ہے اور حضرت سلطان العاشقین برہان المحققین قطبِ زمان مخدومنا خواجہ محمد سلیمان صاحب تونسوی علیہ الرحمتہ کے خاص الخاص ملفوظات کا ذخیرہ ہے، جس کو مولوی یار محمد صاحب نے بارشادِ عالی جناب قطب الاقطاب حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب تونسوی رضی اللہ عنہ **مناقب سلیمانیہ** مؤلفہ حافظ صاحب موصوف سے منتخب کیا۔ اس کے مطالعہ سے اہلِ راہِ راست پر آتا ہے و صاحبانِ بصیرت کا نورِ ایمان زیادہ ہوتا ہے۔ یہ کتابِ لاجواب اپنے حسنِ صوری کے لحاظ سے بصارتِ ظاہری کو روشن کرنے والی اور حسنِ معنوی کے اعتبار سے بصیرتِ باطن کو جلا دینے والی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے حضرت غریب

نواز کے ملفوظات میں دو تین کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن حق تو یہ ہے کہ ایسی
خوبی کے ساتھ آج تک کوئی مناقب طبع نہیں ہوا۔ یہ کتاب اپنی طرز میں
واقعی بے نظیر اور مخصوص ہے''۔

خواجہ پیر پٹھان غریب نواز کے ملفوظاتی سرمائے میں یہ مجموعہ کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں ان کی پُر انوار زندگی کے مناظر بھی ہیں اور ان خوش کلامی کے انداز بھی۔ اس مجموعے کے مرتب تونسہ مقدسہ کی خوش آثار بستی کے نواح میں آباد ایک قریے بنڈی کے متوطن تھے، لیکن مابعد کے تذکرہ نگار انھیں پاک پتن کا باشندہ لکھتے رہے۔ وہ خواجہ پیر پٹھان کے مرید تھے اور ان کے وصال کے بعد اڑتیس سال تک زندہ رہے۔ ان کی قبر تونسہ مقدسہ کے قدیمی قبرستان میں مرجعِ خلائق ہے۔ ان کے مرتبہ اس مجموعے کو بے پناہ شہرت اور ناموری میسر آئی۔ دیگر مجموعوں کے برعکس اس کے سب سے زیادہ خطی نسخے محفوظ رہے۔ پاکستان اور اس کے باہر کے کتب خانے بھی اس کے وجود کی خوش آہنگی سے فیضیاب ہیں۔

مناقب المحبوبین حاجی نجم الدین سلیمانی کا مرتبہ مجموعۂ احوال و مناقب ہے۔ اس مجموعے میں سلسلۂ چشتیہ کے تمام صوفیہ کے مختصر احوال لکھے گئے ہیں، لیکن مؤلف نے حضور قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی اور اپنے پیر و مرشد خواجہ پیر پٹھان غریب نواز کے احوالِ گرامی اور ملفوظاتِ عظامی کی ترقیم میں اپنا زورِ قلم دکھایا ہے۔ وہ مدت تک تونسہ مقدسہ کی خوش آثار فضا میں اقامت گزیں رہے اور خواجہ تونسوی کی خوش کلامی کے مناظر کی عکس اندازی میں سرگرمِ کار رہے۔ یہ مجموعہ بھی اصلاً فارسی میں ہے اور دو بار اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کے اردو میں دو ملخص بھی چھپ چکے ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

مناقب المحبوبین: پروفیسر افتخار احمد چشتی: اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور: ۱۹۷۷ء/۱۳۹۷ھ: ۲۴۰ص

قرۃ العین: محمد عثمان غنی چشتی میروی: ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی: س ن: ۱۵۲ص

یہ ملفوظاتی مجموعے کیا ہیں؟ جہانِ معانی کی جمالیاتی تہذیب کا خزینہ ہیں۔ان میں پیر پٹھان کی خوش آثار مجالس کے رنگ بھی ہیں اور اس کے مظاہر بھی؛ ان میں ان کی فکری اور تہذیبی شخصیت کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے اور خوشبو بھی۔ان میں زندگی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ منکشف بھی ہے اور بے حجاب بھی؛ ان میں محبت کی مہکار بھی ہے اور انسان دوستی کی پھوار بھی؛ ان میں تاریخ بھی ہے اور روایت بھی؛ ان میں تمثیل کا رنگ بھی ہے اور حکایت کا آہنگ بھی؛ ان میں نیکی اور رواداری کی ترغیب بھی ہے اور صداقتِ احساس کی تہذیب بھی۔ان کی فکری اور معنوی حدود اور قیود کا دائرۂ اثر وسعت آشنا ہے۔ان میں زندگی اور اس کی جمالیاتی تہذیب کے کتنے ہی رنگ ہویدا ہیں۔بقولِ شاعر:

ان کی محفل میں آن کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

کہاں جمود و تعطل ہے اُن کی راہوں میں
کہ نقشِ پا بھی وہاں جو ملا روانہ ملا
فرازِ عرش سے لوٹے تو راستے میں انھیں
غبارِ راہ میں لپٹا ہوا زمانہ ملا

نذر صابریؒ

______ حضرت مولانا محی الدین محمد صالح نظامی رحمۃ اللہ علیہ☆

زبدۃ العارفین سند الراسخین زین العاشقین سیدی ومخدومی قبلہ والد ماجد حضرت مولانا مولوی محمد دین نور اللہ مرقدہ کی ولادت ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور اسی سال حضرت کریم محبوب ذی العرش خواجہ اللہ بخش تونسوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا۔ آپ کا اسم گرامی محمد دین حضرت کریمؒ نے ہی رکھا۔ شیخ کامل کی توجہ سے اللہ کریم نے آپ کو اسم بامسمّی کر دیا۔ آپ رئیس القانعین سید المتوکلین حضرت مولانا خواجہ غلام محی الدین احمدؒ کے دوسرے اور چہیتے فرزند تھے۔ دینی اور روحانی ماحول میں آنکھ کھولی جس وقت مکھڈ شریف علم وعرفان کا مرکز تھا۔ صرف اطرافِ ملک ہی نہیں بلکہ بلخ و بخارا سے لوگ آکر علم ومعرفت کی تشنگی بجھاتے تھے۔ اس مدرسہ کی بنیاد شمس العارفین قطب الکاملین حضرت مولانا شاہ محمد علیؒ مکھڈی قدس سرہ نے رکھی اور اس کو عروج محی السنۃ حضرت مولانا غلام محی الدین احمدؒ کے تابناک دور میں ملا جو نہایت درخشندہ دور تھا۔ علما اس کثرت سے تھے جس طرح سنگلاخ زمین میں سنگریزے، تو ایسے درخشندہ دور میں آپ کی تربیت ہوئی۔ گھر ہی میں دینی علوم کی ابتدا و انتہا ہوئی، گھر ہی میں قابل و مایہ ناز اساتذہ میسر آئے۔ جامع العقول استاذ الاساتذہ مولانا قطب الدین صاحب غورغشی (اٹک) جیسے استاد گھر ہی میں ملے اور سب سے بڑھ کر اپنے والدِ مکرم پیرومرشد کی نظرِ شفقت بھی ادھر ہی مبذول ہوئی اور یہ اپنے والدِ گرامی کی نظرِ شفقت کا نتیجہ تھا کہ دو طرح سے فرزندی کی سعادت نصیب ہوئی اور شرف تلمذ بھی نصیب ہوا، اسی لیے آپ ظاہری و باطنی علم میں یکتا ہوئے۔ آپ کا پُرنور دل اپنے پیرومرشد کی محبت سے

☆ فرزندِ دلبند حضرت مولانا محمد الدینؒ مکھڈی۔ وصال مبارک۔ ۷ ربیع النور۔ ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء آپؒ کا مزار مبارک اپنے والدِ مکرم کے قدموں میں خانقاہ مولاناؒ کے جنوب غربی جانب مرجع خلائق ہے۔

سرشار تھا، اس لیے ہر قول و فعل میں اپنے والدِ گرامی کے پیروکار تھے۔ اپنے مشائخ عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی محبت کی جو شمع والدِ گرامی نے روشن کی، اسے تادمِ واپسیں بجھنے نہ دیا۔ اپنے شیخؒ کے وصال کے بعد اسی طرح تونسہ مقدسہ کی حاضری کو اپنی زندگی کی اساس سمجھا بلکہ متاعِ ایمان سمجھا۔ صحت ہو یا مرض، تکلیف ہو یا راحت کسی حال میں تونسہ شریف کی حاضری نہیں چھوٹی۔ اپنے والدِ گرامی کی سنت کے مطابق ہر سال چہلم گزارتے تھے۔ آپ کا منور پُرسکون دل کبھی بھی اس دنیاؤں کے حوادثات سے متزلزل نہیں ہوا۔ اس لیے ہی تو حضور رحیم خواجہ محمود عالم تونسوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

''محمد دین طبع سلیم دارد خدائے بروے راضی باشد۔ یہ ہر کسی کے شر سے محفوظ رہے گا۔'' مرید پیروں کو اعزاز و القاب دیتے ہیں اور یہ سندِ اعزاز مرید کو پیر کی طرف سے عطا ہوئی جو کئی اعزازوں، القابوں سے بڑھ کر ہے۔

راقم آثم نے آپ کی زبان سے سنا کہ حضور رحیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (حضرت خواجہ محمود غریب نواز تونسویؒ) تونسہ مقدسہ رخصت کے وقت روضہ مقدسہ اعلیٰ خواجہ خواجگان خواجہ شاہ سلیمان تونسوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر دعا فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ہم دونوں بھائی مولانا قمر الدینؒ اور میں اکٹھے رخصت طلب ہوئے تو حضور نے حضرت کریم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (حضرت خواجہ اللہ بخش غریب نوازؒ) کے قریب کھڑے ہو کر کافی لمبی دعا فرمائی اور اس دعا میں یہ الفاظ بھی تھے کہ انھیں بخت دِلا، پھر فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ دنیاوی بخت بلکہ اپنی غلامی کا بخت، شاید اسی بخت کے متعلق خواجہ حافظ شیرازیؒ نے فرمایا تھا:

گدائی درِ جاناں بسلطنت مفروش
کہ سایہ ایں در بہ آفتاب رسد

بلاشبہ اسی دعا کا اثر تھا کہ آپ کو یہ سعادتِ ابدی نصیب ہوئی۔ ایک دفعہ کسی نے کہا کہ آپ گھر چھوڑ کر چالیس چالیس دن تونسہ مقدسہ پڑے رہتے ہیں حالانکہ پیچھے گھر میں عموماً عسرت

رہتی ہے۔ کیا حاصل ہوا؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں تو یہاں رہنے کو سب سے بڑا حاصل سمجھتا ہوں۔ یہ اپنے قدموں میں رہنے دیتے ہیں، یہی سب سے بڑا فائدہ اور حاصل ہے اور یہ شعر زبان مبارکہ پر آیا:

اسی تقریب، اسی گلی میں رہے
منتیں ہیں شکستہ پائی کی

اور اس غلامی کا صدقہ تھا کہ آپ کا سینہ بے کینہ محبت سے مسرور و معمور تھا۔ محبوبِ خدا ﷺ کا عشق نصیب ہوا۔ رحمتِ دو عالم کا جب بھی اسمِ مبارک زبان پر آتا، چشمانِ مبارک پُر آب ہو جاتیں، آواز رُک جاتی، اپنے شیخ کا صدقہ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ حاضری نصیب ہوئی۔ غالباً دو مرتبہ پیر و مرشد عالی مقام حضرت خواجہ تونسوی " (حضرت خواجہ غلام نظام الدین تونسوی) کی معیت میں حاضری نصیب ہوئی، دوسری مرتبہ رمضان المبارک مدینہ طیبہ گزارا، اور کچھ ایسا سرور نصیب ہوا کہ درِ حبیب ﷺ پر گزرے لمحات کسی وقت نہ بھولتے، ہر وقت حاضری کی تڑپ رہتی، رمضان المبارک مدینہ طیبہ گزارنے کو جی چاہتا مگر دنیاوی اسباب میسر نہیں تھے۔ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں دن کو آرام فرمانے کے بعد بیدار ہوئے تو زبان مبارک پر یہ رباعی جاری تھی:

جد بفضلک یاالٰہی قد بابک یارسول
یاغیاث المستغیثین، یامعینی، یارسول
لیس لی شئی من الزاد و جوازالسبیل
ان دعوت العبد کرما وزال ممناع السبیل

ترجمہ:

مجھ پر جود و کرم فرما: یاالٰہی، اپنے دروازے کھینچ یارسول ﷺ۔ اے فریاد کرنے والوں کے فریاد رس، اے میرے مددگار یارسول ﷺ۔ میرے پاس کچھ بھی زادِ راہ نہیں، اگر تو اپنے غلاموں کو کرم سے بلالے تو سب رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔

یہ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ، کہنے والے کے سچے ایمان و عشق کے آئینہ دار ہیں۔ یہ انھیں سکھائے جاتے ہیں، انھیں پڑھائے جاتے ہیں جو محبوب ہوتے ہیں اور جو مطرود ہوتے ہیں تو وہ ''بشر مثلی'' کا ورد کرتے ہوئے ایمان سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ اس لیے وہ پاس رہ کر بھی دور ہو جاتے ہیں اور اسی غرورِ تکبر میں پیوستِ خاک ہو جاتے ہیں۔ ایمان کا قرب ایمان والوں ہی کو ملتا ہے۔ یہ استغاثہ بارگاہِ رسالت میں درحقیقت بارگاہِ الوہیت میں استغاثہ ہے کیونکہ وہی مرکزِ توحید و مرکزِ ایمان ہے اور جس نے اس سے منہ پھیرا، اسے کبھی بھی قربِ الٰہی نصیب نہیں ہو سکتا اور انھیں کے متعلق فرمانِ خداوندی ہے کہ

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

یہ پکار دل کی گہرائیوں سے نکلی جس کی اجابت منتظر تھی۔ درِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاوہ آ گیا اور حاضری نصیب ہوئی۔ حسبِ خواہش رمضان المبارک مدینہ طیبہ زیرِ سایہ عرشِ علیٰ گزارا اور تا ایامِ حج مدینہ اطہر ہی میں ٹھہرے رہے، پھر مکہ مکرمہ میں حاضر ہوئے۔ حج ادا کر کے واپس وطن تشریف لائے۔ اب کی مرتبہ اس ناچیز کو بھی شرفِ ہم رکابی بخشا۔ شعبان المعظم کی چار تاریخ کو گھر سے روانہ ہوئے۔ پہلے تونسہ مقدسہ حاضری دی، پھر مہاراں شریف زیارت کے لیے حاضر ہوئے اور آپ کا یہ معمول تھا کہ حجازِ مقدس حاضری سے قبل تونسہ مقدسہ اور مہاراں شریف حاضری دیتے اور واپسی پر بھی اسی طرح۔ پھر کراچی حاجی غلام صمدانی صاحب مرحوم کے ہاں پہنچے۔ تقریباً ہفتہ عشرہ کراچی آ گیا۔ کراچی سے حاجی غلام صمدانی صاحب بھی ہمراہ ہوئے۔ انیس شعبان المعظم کی چھبیس تاریخ کو مدینہ منورہ حاضر ہو گئے۔ پھر سارہ ماہِ رمضان المبارک سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ اقدس پر گزارا۔ رمضان المبارک کے بعد خواجہ حاجی غلام مرتضیٰ صاحبؒ بمعہ حضرت پھوپھی صاحبہ واپسی پر آمادہ ہوئے (وہ ہم سے چند روز قبل عمرہ کے لیے تشریف لائے تھے اور رمضان المبارک انھوں نے بھی مدینہ طیبہ میں گزارا تھا۔) اور حاجی غلام صمدانی صاحب بھی بوجہ علالتِ طبع واپس ہونے کے لیے تیار ہوئے۔

حضرت قبلہ والد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کی تیاری سے میرے دل پر ملال آیا اور ان خیالات نے ہجوم کیا کہ عمرہ ہوگیا، زیارت ہوگئی، ان کے ہمراہ ہم بھی واپس ہو جائیں۔ انھیں خیالات کے ساتھ صبح حرم شریف میں نمازِ صبح کے لیے حاضر ہوا، جتنی دیر حرم شریف میں بیٹھا رہا، یہی خیالات گردش کرتے رہے۔ جب صلوۃ وسلام کے لیے بارگاہِ اقدس میں مواجہ شریف کے سامنے حاضری دی تو خیالات بالکل دل سے دور ہو گئے اور یہ القا ہوا کہ کوئی رہے یا جائے تو اطمینان سے یہیں رہ۔ گویا کہ رہنے کی اجازت دی گئی بلکہ حکم صادر ہوا۔ پھر اس مہمان کی کتنی خوش نصیبی ہے، کتنی شان ہے جسے بادشاہِ جہاں مزید ٹھہرنے کا حکم فرما رہے ہیں، چنانچہ انھیں کے صدقے ہمیں بھی ساتھ رہنا نصیب ہوا۔ شوال المکرم کا مہینہ گزرا، ذی القعد طلوع ہوا۔ پندرہ ذی القعدہ کو حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت دی گئی۔ اس تاریخ کو ایک سچے محبت کرنے والے نے خواب میں دیکھا کہ سیّدی ومخدومی مدینہ طیبہ حرم نبوی سے شرفاً تعظیماً باب السلام سے آ رہے ہیں اس شان سے کہ آپ گھوڑے پر سوار ہیں اور ساتھ کئی خوبصورت نورانی چہروں والے پیدل ہیں۔ بارش ہو رہی ہے لیکن پانی کے قطرات نہیں بلکہ نورانی قطرے ہیں۔ یہ اشارہ تھا کہ جس کو ٹھہرا گیا تھا اس کو کسی قدر اعزاز سے روانہ کیا گیا پھر دوسرے سال ٹھیک اسی تاریخ پندرہ ذی القعدہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا عاشق اس دنیا دوں سے رختِ سفر باندھ کر اپنے سچے مالک کے پاس چلا گیا۔

فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِر

خلفائے مولانا محمد علی مکھڈیؒ

مولانا حافظ عابد جی مہارویؒ، مولانا زین الحق والدینؒ مکھڈی

محمد ساجد نظامی

حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے متعدد خلفا ہوئے جن میں کئی علما وفضلا شامل ہیں۔ چونکہ آپ نے مجرد زندگی گزاری اسی لیے آپ کے خلفا میں آپ کے شاگرد اور تربیت یافتگان شامل ہیں۔ وہ اشخاص جنھوں نے آپ کے مشن تعلیم وتربیت کو آگے بڑھایا اُن میں تمام حضرات علم وفضل میں اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں سے وہ شخصیات جو مولانا کے مسند نشین ہوئے درج ذیل ہیں۔

☆ حضرت مولانا حافظ عابد جیؒ مہاروی (م۔۱۲۶۲ھ /۱۸۴۶ء)

☆ حضرت مولانا زین الدین انگویؒ معروف بہ زینت الاولیا (م۔۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء)

☆ حضرت غلام محی الدین احمدؒ مکھڈی [۱] (م۔۱۳۳۸ھ /۱۹۲۰ء)

☆ حضرت مولانا محمد احمد الدینؒ مکھڈی [۲] (م۔۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء)

☆ حضرت مولانا فضل الدینؒ مکھڈی [۳] (م۔۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء)

☆ حضرت مولانا فتح الدین مدظلہ العالی [۴] (موجودہ سجادہ نشین)

زیر نظر تحریر میں ابتدائی دو شخصیات کے احوال وآثار پیشِ خدمت ہیں۔

حضرت مولانا حافظ عابد جیؒ مہاروی

حضرت مولانا حافظ عابد جیؒ مہاروی، مہار شریف (موجودہ: تحصیل چشتیاں شریف، ضلع بہاولنگر) سے تحصیلِ علم کی خاطر حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کی خدمت میں تشریف فرما ہوئے۔ حضرت حافظ عابد جیؒ مہاروی ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی علوم سے بھی بہرہ مند ہوتے رہے۔ بیعت وخلافت سے مستفید ہو کر حضرت مولاناؒ مکھڈی کے ساتھ ہی رہے۔ حضرت

مولاناؒ مکھڈی کے وصال ۲۹ رمضان المبارک ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء کے بعد حضرت پیر پٹھان شاہ محمد سلیمانؒ تونسوی کے حکم واجازت سے پہلے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ ۹ سال تک حضرت مولاناؒ مکھڈی کی خانقاہ پر سجادہ نشین رہے۔ علم وعمل میں حضرت مولاناؒ مکھڈی کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ۱۶ جمادی الثانی ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء کو تونسہ مقدسہ میں وصال ہوا۔ آپ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ تونسہ مقدسہ میں ہی جنازہ ہوا اور حضرت پیر پٹھان شاہ محمد سلیمانؒ تونسوی کے حکم و اجازت سے آپؒ کے فرزندِ اکبر حضرت خواجہ گل محمد تونسویؒ کے قدموں میں آسودۂ خاک ہیں۔

حضرت مولانا حافظ عابد جیؒ مہاروی کے بارے میں یہ ہی مختصر حالات ''تذکرۃ الولی'' ۵ میں ملتے ہیں۔ ایک، دو واقعات کے علاوہ آپؒ کی شخصیت کے بارے میں مکھڈ شریف کے کسی تذکرے میں تفصیلی حالات نہیں ملتے۔

حضرت مولانا زین الدین انگویؒ معروف بہ زینت الاولیا

ابتدائی حالات:

آپؒ کا اسم گرامی حضرت خواجہ زین الحق والدین ؒ ہے۔ زینت الاولیا کے نام نامی سے معروف ہوئے۔ آپؒ کے والدِ گرامی حضرت حافظ امیر گلؒ ابن میاں مبارک خانؒ ابن میاں عادل خانؒ ۶ تھے۔ آپؒ کا آبائی وطن انگہ (خوشاب) تھا۔

ابتدائی تعلیم:

حضرت خواجہ زین الحق والدینؒ نے ابتدائی تعلیم موضع کفری (خوشاب) میں مولوی غلام نبیؒ سے حاصل کی۔ بعد ازاں موضع لیٹی (چکوال) میں محمد روشنؒ سے درس لیتے رہے۔ پھر یہ نابغہ روزگار مکھڈ شریف میں حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے درس میں آن شامل ہوئے۔ یہ ایسی درسگاہ تھی کہ جو طالبِ صادق یہاں حصولِ علم کے لیے آیا وہ زمانے کا استاد ٹھہرا۔ یہاں ابتداً ''زلیخا'' کے پڑھنے کا ذکر ''تذکرۃ الولی'' میں ملتا ہے۔ اس ابتدا کے بعد منتہیٰ تک اسی درسگاہ میں

تعلیم حاصل کی۔ مولانا محمد علیؒ مکھڈی نے آپؒ کو ظاہری و باطنی علوم کے بحرِ بے کنار کا راہی بنا دیا۔ حضرت شمس الدینؒ سیالویؒ آپ کے ہم سبقوں میں سے تھے۔

ازدواجی زندگی:

آپؒ کی شادی مبارک حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے حکم سے جناب ملک شاہ نواز کی ہمشیرہ سے ہوئی جو آپؒ کے جدِ امجد فتح خاںؒ کی اولاد میں سے تھے۔

اولادِ اطہار:

آپؒ کے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھی۔ صاحبزادی کا اسمِ گرامی بی بی غلام فاطمہؒ تھا جو عمر میں اپنے بھائیوں سے بڑی تھیں۔ آپؒ کے دو صاحبزادوں میں ایک صاحبزادے کا اسمِ گرامی سراج الدینؒ تھا جو خوردسالی میں ہی وصال فرما گئے۔ حضرت سراج الدینؒ کا مزار مبارک روضہ پاک حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی سے متصل شرقی جانب قبرستان میں واقع ہے۔ دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا محکم الدینؒ ہوئے۔ جن کا وصال مبارک ۱۸ سال کی عمر میں عین عالمِ شباب میں ہوا۔ آپؒ شرم و حیا کا پیکر تھے۔ حضرت مولانا محکم الدینؒ کا مزارِ پُر انوار روضہ پاک کی غربی دیوار سے متصل مرجع خلائق ہے۔ سن وصال ۱۲۷۶ھ ہے۔ دونوں برادران حضرت مولانا زین الحق والدینؒ کی حینِ حیات میں وصال فرما گئے تھے۔ اسی لیے حضرت زینت الاولیاؒ کے وصال مبارک (۱۳ محرم الحرام، ۱۲۹۵ھ) کے بعد آپؒ کے نواسے حضرت مولانا غلام محی الدین احمدؒ خانقاہ معلّٰی کے خلیفہ و سجادہ نشین ہوئے۔

بیعت و خلافت:

حضرت خواجہ زین الحق والدینؒ نے حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ حضرت مولاناؒ کے پہلے سجادہ نشین حضرت مولانا حافظ عابد جیؒ کے وصال کے بعد غوثِ زماں حضرت شاہ محمد سلیمانؒ تونسوی کے حکم سے مولاناؒ مکھڈی کے سجادہ نشین ہوئے۔ حضرت پیر پٹھان شاہ محمد سلیمانؒ تونسوی نے آپؒ کو وظائف اور فیض باطنی سے بھی سرفراز فرمایا

آپؒ کم وبیش ۲۳ سال تک خانقاہِ معلیٰ حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے سجادہ نشین رہے۔ ان ماہ و سال میں درسگاہ و خانقاہ سے کئی نابغہ روزگار فضلا و خلفا آپؒ کے تربیت یافتہ ہوئے۔

شاگرد و خلفا: آپؒ کے شاگرد و خلفا میں حضرت استاذ مولوی خورشید لنگڑیالی۹، حضرت استاذ حافظ عبدالقدوسؒ چھچھوی۱۰، حضرت مولانا عبدالنبی بھوئی گاڑوی۱۱، حضرت مولانا غلام محی الدین احمدؒ مکھڈوی۱۲، حضرت مولانا سلطان محمود ناگیؒ بندیالوی۱۳۔

مہر مبارک: آپؒ کی مہر مبارک پر یہ شعر کندہ تھا۔

سلیمانؒ محمد علیؒ نامور

وزیشاں شدہ زین الدیں بہرہ ور

''تذکرۃ الصدیقین'' میں حضرت مولانا محمد الدینؒ مکھڈی لکھتے ہیں۔

حضرت کی عادت مبارک تھی کہ اگر کوئی غلام کوئی سفارش نامہ طلب کرتا تو اس کے طلب کے موافق تحریر فرما دیتے۔ اگر اس کی خواہش ہوتی تو اس سفارش نامہ پر اپنی مہر مبارک بھی ثبت فرما دیتے اور مہر لگانے والے کو حکم فرماتے کہ خط کے آخر میں مہر لگاؤ، سر پر نہ لگاؤ۔۱۴

غلامان و خادمان: حافظ محمد قاسم پراچہؒ، میاں سلطانؒ، میاں احمد خوشابیؒ

جماعت میں امام: فقیر فیضؒ

مناقب فی شان زینت الاولیا:

آپؒ کی شان میں آپ کے شاگردوں اور خلفا نے نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ اپنے پیر ومرشد کی مناقب لکھی ہیں۔ ان میں عربی وفارسی اور پنجابی میں متعدد کلام موجود ہے جو عقیدت ومحبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ فنی پختگی میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ آپؒ کے منقبت نگاروں میں مصنف ''تذکرۃ المحبوب'' مولانا عبدالنبیؒ بھوئی گاڑوی، مولانا سلطان محمود ناگیؒ بندیالوی ،مولانا غلام حسینؒ تنولی، عالم شاہ گجراتی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رخ تو غیرتِ گلستان است
زانکہ بر لالہ عنبر افشان است
صفحۂ روئے تو بہ آیتِ خال
عاشقاں را بجائے قرآن است
بلبلِ شاخسار گلشنِ قدس
ایں سخن ہر صباح گویان است
کہ بجز ذاتِ پیر نیست کسے
زانکہ او بحرِ فیضِ سبحان است

(حضرت مولانا عبدالنبیؒ بھوئی گاڑوی)[۱۵]

☆

ز جانِ خود پے جاناں کبابے کردہ ام پیدا
بجامِ پردۂ دل خوں شرابے کردہ ام پیدا
بہ چشمِ من دمادم چوں خیالِ یار می آید
بپا شوئیش ازو چشم، گلابے کردہ ام پیدا
بجانم بوئے زلفش گر بدست آید ، خریدارم
دو عالم را بہ یک دیدن نصابے کردہ ام پیدا
زمن پرسید ناؔمی ، کز کجائی و کدام ہستی؟
غلامِ شاہ زین الدینؒ جوابے کردہ ام پیدا

(مولانا سلطان محمود ناؔمی بندیالوی)[۱۶]

چہ شور انداخت در جانم ، جمالِ شیخ زین الدینؒ
چہ رعب افتاد در جاں از جلالِ شیخ زین الدینؒ

بجاں اندر خیالِ او ، چو جاں در جسم می دارم
خیالِ او خیالِ من ، خیالِ شیخ زین الدینؒ
اگر خواہی وصالِ حق ، شنو از صدقِ دل جانم !
وصالِ حق بداں اندر ، وصالِ شیخ زین الدینؒ
نداند چشمِ ظاہربیں ، کمالِ پیرِمن ہرگز
بہ بیں از دیدۂ مجنوں ، کمالِ شیخ زین الدینؒ
بہ ظاہر بنگری مشک است و در معنی چو خور تاباں
بباطن یوسفِ ثانی ، جمالِ شیخ زین الدینؒ
نہالِ باغِ جاں خوانم ، قد والائے موزونش
عجب زیباست و بس رعنا ، نہالِ شیخ زین الدینؒ
غلاما مطلبِ خود گو ، ازیں اشعارِ ناموزوں
کہ آرد یاد در بزمش قوالِ شیخ زین الدینؒ

(حضرت مولانا غلام حسین تنویؒ) ۱۷

شاہ زین الدینؒ ثانی بایزیدؒ
ہر کہ منکر اوست بدتر از یزید
بعضے اہلِ شہر مثلِ آں لعیں
لعنۃ اللہ علیہم اجمعین

(عالم شاہ گجراتی) ۱۸

وصال مبارک:

آپؒ کا وصال مبارک ۱۳ محرم الحرام ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء کو ہوا۔ آپ کا مزار مبارک حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے مزار سے متصل شرقی جانب روضہ مقدسہ میں مرجع خلائق

ہے۔ ہر سال آپ کا سالانہ عرس مبارک ۱۳،۱۲،۱۱ محرم الحرام کو نہایت عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔

آپ کے وصال کے بعد آپ کے نواسے حضرت مولانا غلام محی الدین احمدؒ خانقاہ مولاناؒ مکھڈی کے سجادہ نشین ہوئے۔ آپ علم و فضل میں اپنے اسلاف کی ہی تصویر تھے اور انھیں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے زندگی پر خانقاہِ مولانا پر رہتے ہوئے درس و تدریس کے سلسلے کو جاری و ساری رکھا۔ بڑے بڑے علما نے آپؒ سے فیض حاصل کیا۔

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ آپؒ حضرت مولانا زین الحق والدین مکھڈیؒ کے نواسے تھے۔ اپنے نانا بزرگوار کے وصال کے بعد خانقاہ مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے سجادہ نشین ہوئے۔ علم و فضل میں اہم مقام پر فائز تھے۔ آپ کے عہدِ سجادگی میں خانقاہ و درسگاہ نے بڑی وسعت پائی۔ خانقاہ میں مہمان خانے اور اساتذہ و طلبا کے رہائشی کمرے تعمیر ہوئے۔ کتب خانہ کی بھی نئی عمارت بنائی گئی۔ آپ کے دور میں کتب کے ذخیرہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ''قندیلِ سلیماں'' کے اگلے شمارے میں ان شاء اللہ آپ کے احوال و آثار پر مضمون شائع کیا جائے گا۔

۲۔ آپؒ حضرت مولانا غلام محی الدین احمدؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خانقاہِ مولاناؒ ہی میں حاصل کی۔ حضرت خواجہ غلام اللہ بخش تونسویؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ پاکستان کے پیش رووں میں شامل رہے۔ دو بار حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کے علاوہ افغانستان، ترکی اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں تعلیم و تعلم اور جہاد کی غرض سے سفر فرمائے۔ قلندر منش صوفی تھے۔ مکھڈ شریف میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی ترویج و ترقی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے مسلسل مصروفِ کار رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے زندگی کے آخری ایام تک جدوجہد جاری رکھی۔ اپنے خطے کے مسلمانوں کو مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوالوں سے مضبوط دیکھنے کے نہ صرف خواہش مند رہے بلکہ اس کے لیے عملی کاوشیں بھی کیں۔ ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء کو مکھڈ شریف میں وصال فرمایا۔ خانقاہِ مولانا محمد

علی مکھڈیؒ پر روضہ مبارک کے جنوب شرقی سمت آپؒ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔
۳۔ آپؒ مولانا محمد احمد الدینؒ مکھڈی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ولادت باسعادت ہوئی۔ تعلیم و تربیت اپنے اسلاف کے زیرِ سایہ ہوئی۔ حضرت خواجہ محمود تونسوی "غریب نواز" سے بیعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۲۰۰۸ء میں وصال فرمایا۔ آپؒ کے تفصیلی حالات پڑھنے کے لیے راقم کی تحریر "پیکر صدق وصفا۔ حضرت مولانا فضل الدین چشتیؒ۔ " مشمولہ: معین الاسلام، بیربل شریف، سرگودھا (جولائی تا ستمبر) ملاحظہ فرمائیے۔

۴۔ حضرت مولانا فتح الدین مدظلہ العالی مولانا فضل الدین چشتیؒ کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ آپ خانقاہِ معلّٰی حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے موجودہ سجادہ نشین ہیں۔ علم و فضل میں اپنے اسلاف کی تصویر ہیں۔ خانقاہ معلّٰی میں علمی و تعمیراتی سرگرمیاں آپ کی ذات کی مرہونِ منت ہیں۔ اسلامی علوم کے ساتھ عصری علوم کی ترویج و ترقی میں شب و روز کوشاں ہیں۔ مکھڈ شریف اور اس کے گرد و نواح میں تعلیم اور صحت ہر دو شعبوں میں اُن کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ فری ڈسپنسریاں اور ۳۰ سے زائد سالوں سے فری آئی کیمپ کا انعقاد اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اللہ رب العزت اپنے حبیبِ کریم کے تصدق میں انھیں صحت و سلامتی سے رکھے اور ہمارے سروں پر ان کا سایہ ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ آمین بجاہ نبیک الکریم۔

۵۔ "تذکرۃ الولی" حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے احوال و آثار پر مشتمل کتاب ہے۔ اس میں "تذکرۃ المحبوب" مصنفہ: مولانا عبدالنبیؒ کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے اور جو روایات اپنے والدِ مکرم حضرت مولانا غلام محی الدین احمدؒ اور دیگر احباب سے حضرت مولانا محمد الدینؒ مکھڈی نے سنیں ان کو "تذکرۃ الولی" میں جمع فرما دیا۔ یہ کتاب مطبع شمس ملتان سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن "مہر تاباں" کے نام سے اگست ۱۹۹۶ء میں "ماریہ پریس، اسلام آباد" سے شائع ہوا۔

۶۔ محمد الدینؒ، مولانا، تذکرۃ الصدیقین، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، اشاعتِ دوم، س ن

۷۔ "یوسف زلیخا" مولانا عبدالرحمن جامیؒ کی تصنیفِ لطیف، علومِ اسلامیہ کی درس گاہوں میں فارسی نصاب میں شامل رہی۔

۸۔ حضرت مولانا شمس الدین سیالویؒ (م۔ ۱۳۰۰ھ) پیر پٹھان شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے مرید و خلیفہ۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار ہوئے۔ جناب مرید احمد چشتی نے "فوز المقال فی خلفائے سیال" کے نام سے

دس ضخیم جلدوں میں سیال شریف کے خانوادے اور آپ کے وابستگان کی تاریخ مرتب کی ہے جو ایک لا زوال کام ہے۔

۹۔ لنگڑیال شریف تحصیل پنڈی گھیب (اٹک) کے باسی تھے۔ صوفی و عالم تھے۔ مکھڈ شریف کی خانقاہ سے وابستہ رہے۔ لنگڑیال، پنڈی گھیب سے بسال روڈ پر قریباً ۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر غربی جانب ایک گاؤں ہے جو علم و فضل کا گہوارہ رہا۔ آج بھی اس گاؤں میں مولانا ابراہیم لنگڑیالوی اور مولانا خورشید لنگڑیالوی کی اولاد اطہار موجود ہے جو مکھڈ شریف کی خانقاہ سے اپنی نسبت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ لنگڑیال شریف کے اس خاندان سے کئی عالم اور حافظ پیدا ہوئے۔ حضرت علامہ استاد عبد الغفورؒ بڑی مدت تک مکھڈ شریف کی خانقاہ میں قرآنِ مجید کا درس دیا کرتے تھے۔ آپؒ کے شاگرد ملک کے طول و عرض میں اور بیرون ملک آج بھی اپنے استادِ مکرم کے مشن تعلیمات قرآن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ نہایت سادہ و دلنشیں طبیعت کے مالک تھے۔ شب و روز تعلیم و تعلم اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ آپؒ کا وصال ۱۹۹۴ء میں ہوا۔ مزار مبارک لنگڑیال شریف کے قدیمی قبرستان میں مرجع خلائق ہے۔

۱۰۔ چھچھ (اٹک) کے باشندے تھے۔ حضرت مولانا زین الدینؒ کے شاگرد اور مولانا غلام محی الدین احمدؒ مکھڈی کے اساتذہ میں شامل تھے۔ خانقاہِ معلّٰی کی جامع مسجد کی امامت بھی فرماتے تھے اور شرعی مسئلہ کی تفہیم و توضیح کے لیے فتویٰ بھی جاری فرماتے۔ عمر بھر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ مزار مبارک خانقاہ کی مسجد کے جنوبی مینار کے زیر سایہ مرجع خلائق ہے۔

۱۱۔ بھوئی گاڑ (اٹک) نزد ٹیکسلا کے باشندے تھے۔ والدِ مکرم انھیں مکھڈ شریف کی خانقاہ میں تعلیم و تربیت کے لے آئے۔ حضرت مولانا زین الحق والدینؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ اپنے پیرو مرشد سے والہانہ محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ ''تذکرۃ المحبوب'' کے نام سے فارسی میں اپنے پیر و مرشد کے ملفوظات جمع کیے جو مخطوطہ کی صورت میں کتب خانہ مولانا محمد علیؒ مکھڈی میں محفوظ ہے۔ اس کا فارسی متن حواشی و تعلیقات کے ساتھ ان شاء اللہ جلد شائع کیا جائے گا۔ ''تذکرۃ المحبوب'' کا اُردو ترجمہ حضرت مولانا محمد الدینؒ مکھڈی نے ''تذکرۃ الولی'' اور ''تذکرۃ الصدیقین'' کے نام سے اہلِ نقد و نظر سے داد وصول کر چکا ہے۔

۱۲۔ حاشیہ نمبر ا ملاحظہ ہو۔

۱۳۔ آپ مولانا زین الحق والدینؒ کے خلیفہ و مرید تھے۔ متبحر عالم او ر ہفت زبان شاعر تھے۔ ہنوز ان کا کلام شائع نہ ہو سکا۔ ''جہاں نما'' کے نام سے ضلع شاہ پور (سرگودھا) کی تاریخ لکھی۔ ''گلزار نامی'' کے عنوان سے علم نحو پر ایک رسالہ موجود ہے جس کا خطی نسخہ جناب علامہ اسماعیل شاہ صاحب کے پاس شاہ والا (خوشاب) میں موجود ہے۔ ''جہاں نما'' فارسی میں لکھی گئی جس کا بعدازاں اردو میں ترجمہ ہوا۔ آپ نامی تخلص کیا کرتے تھے۔ کلام میں ایک بڑا حصہ اپنے پیرو مرشد کی مناقب کا شامل ہے۔ جس کے چند نمونے زیرِ نظر مقالہ میں بھی شامل ہیں۔

۱۴۔ محمد الدینؒ، مولانا، تذکرۃ الصدیقین، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، اشاعت دوم، س ن، ص ۳۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۰

☆☆☆

جو ان کے عشق میں آئینہ فام ہو جائے
نصیب اُس کو حضورِ دوام ہو جائے
نظر ہو روضۂ اطہر پہ دل غزل خواں ہو
''تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے''

نذر صابریؒ

عقیدت سے ارادت تک

______ محسن علی عباسی

محبت وہ جذبہ ہے جس کی روشنی کم و بیش ہر انسان کے قلب و باطن میں موجود رہتی ہے۔ اسی جذبے میں انسانی خواہش کو دخل رہتا ہے۔ ظالم سے ظالم معاشروں میں بھی مخلوقِ خدا سے محبت کرنے والے دل و اجسام موجود رہتے ہیں۔ یہ وہ جذبہ ہے جس کو صلاحیت اور اظہار خود رب ذوالجلال نے دیا ہے۔ اپنے تعلق محبت کو اللہ کریم نے اپنے محبوب علیہ الصلاۃ والتسلیم کے ذریعے سے واضح فرمایا ہے۔ اللہ کریم قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتے ہیں!

ترجمہ: (اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنالے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف فرما دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ آل عمران،۳۱)

یہ محبت کا کمال ہے کہ اپنی مرضی ومنشا اور اپنی رضا کو محبوب کی رضا بنایا جائے، ربِ کریم نے کچھ اسی انداز سے نسلِ انسانی کو محبت کا درس دیا ہے۔ جب انسان اللہ کریم کے محبوب ﷺ کی پیروی کو اپنا لیتا ہے، تو رؤف و رحیم ذات اپنی صفتِ جباریت کے بجائے صفتِ رحمت کا نزول فرماتا ہے۔ جب گنہگار اطاعتِ رسول کریم کا شرفِ عظیم حاصل کرتے ہیں تو تب انسان کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ یہی عمل جب کوئی نیک انسان کرتا ہے تو وہ ملکوتی صفات کا حامل ہو جاتا ہے۔ زمیں پر چلتے پھرتے وہی انسان فرشتوں جیسا دکھائی دیتا ہے، بلکہ فرشتے بھی اسے نگاہِ رشک سے دیکھتے ہیں۔

جبریل بھی حیران کھڑا دیکھ رہا ہے

العظمت للّٰہ ! یہ معراجِ بشر ہے

اس عظمت وشوکت کے زمانے میں کم ہی اہل ہوا کرتے ہیں، مگر جنھیں خدا کی خدائی

میں یہ دولت نصیب ہوئی ہے وہ فقیر ہو کر بھی شہنشاہ ہوا کرتے ہیں۔ میری دانست میں ان سے محبت کرنا انسانیت کی مجبوری بن جاتی ہے، کیوں کہ ان سے خود خالقِ کائنات محبت فرما بھی رہا ہوتا ہے اور جن کے نصیب میں چاہتا ہے ان کی محبت ان دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ بس ایک نگاہِ ناز سے دلوں کے زنگ بھی دھلتے ہیں اور انسان اپنی انا، ذات پات سب کچھ ان کے سامنے ہار دیتا ہے۔ طلسم ہوشربا بھی دھواں بن کر اڑ جاتا ہے، زبان گنگ ہو جاتی ہے، عقل پر تحیر طاری رہتا ہے، الفاظ اپنے معانی تلاش کرتے ہیں کہ "لفظ سوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی"

حضرت حافظ غلام محمود چشتی نظامی (حافظ جیؒ) بھی ایسے ہی ولی اور محبوب رسول ﷺ تھے۔ آپ کے والدِ محترم کا نام حضرت گوہر دینؒ تھا۔ آپ (حافظ جی) ضلع اٹک پنجاب میں ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے مرشدِ پاک حضرت خواجہ زین الدین چشتی نظامیؒ تھے۔ آپ کی نگاہِ ناز سے بہت سے دلوں کو قرار نصیب ہوتا رہا، آپ مجھ ناچیز سمیت بہت سے دلوں کی دھڑکن تھے۔ اللہ کریم کی لاریب کتاب کے حافظ تھے اور یقیناً پورے قرآن کے عامل بھی تھے۔ ہر روز ایک کثیر حصہ قرآنِ شریف کی تلاوت فرماتے، دنیا کے لوازمات بھی پورا فرماتے۔ آپ کی حیاتِ طیبہ اللہ کریم کے پیارے محبوب ﷺ کی پیروی میں بسر ہوتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی آپ کے دربار میں آیا، خالی نہ گیا۔ ناچیز کو یہ سعادتِ عظمٰی دورانِ اعتکاف حرمین شریفین کے بعد سب سے بڑے عالمی شہرِ اعتکاف (منعقدہ تحریکِ منہاج القرآن) حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے شہرِ لاہور میں نصیب ہوئی۔

سرکار اپنے حجرہ مبارک میں موجود تھے، آقا کریم کی محفل میلاد سے مخاطب تھے۔ نگاہ جھکی ہوئی، چہرہ انور عشق رسول اور فنا فی الرسول کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ راقم نے قدم بوسی کی سعادت حاصل کی۔ اسی لمحے دل سے صدا بلند ہوئی کہ

مر کے پہنچا ہوں یہاں اس دلربا کے واسطے

یہی الہام آپ کی قدم بوسی کا شرفِ عظیم حاصل کرنے کے لیے کراچی لے گیا۔ مردِ درویش کے

آنگن میں جا بجا محبتوں کے پھول کھلے تھے۔ ہر ہفتے دو دن، جمعرات اور اتوار کو حضور کی اجازت سے محفلِ میلاد ﷺ منعقد ہوا کرتی تھی۔ حضور کے اہلِ بیعت، قرآن کے قاری، نعت خواں اور علماء کرام اگلی صف میں اور باقی تمام احباب پچھلی صفوں میں براجمان ہوا کرتے تھے۔ آپ کی مجلس میں صاحبانِ علم، علم کی شمع روشن کر کے روانہ ہوتے اور صاحبانِ عشق و متلاشیانِ حق جلوہ خاص سے اپنی ضیا کو روشن کرتے۔ آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے احساس ہوا کہ یہاں قدر صرف خدا کی خدائی کا ہے جو آپ کے پاس چل کر آئے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ مخلوق جو میرے پاس آئی ہے اسی کے سامنے سارے سوال کیے جائیں کہ یہ " اللہ کا کنبہ ہے۔" رب کریم گواہ ہے! کہ اتنی نیاز مندی سے مخلوقِ خدا سے محبت کرتے ہوئے کسی عالی مرتبت کو نہیں دیکھا۔ لنگر شریف کی تقسیم پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ حضور ﷺ کا لنگرِ خاص ہے، میں نے یہ محفل خصوصی طور پر آقا کریم کی اجازت سے شروع کر رکھی ہے، حضور نے فرمایا ہے کہ (حافظ جی) فکر نہ کیجیے گا لنگر کا ذمہ ہمارا ہوگا۔ ایک واقعہ جو ناچیز کو یاد رہ گیا کہ ایک لڑکے نے بُرے خوابوں کی شکایت کی، آپ نے اسی لمحے قرآن مجید کی آیتِ مبارکہ تلاوت فرمائی:

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کی برات (کا دعویٰ) نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی کا بہت ہی حکم دینے والا ہے۔ (سورۃ یوسف، ۵۳)

آپ فرمانے لگے کہ نفس امارہ ہی کی وجہ سے انسان کو بُرے خواب آتے ہیں۔ جب انسان نفسِ امارہ پر قابو پا لیتا ہے تو خوابوں میں بشارات کا دروازہ کھلتا ہے، فرمانے لگے: اسی دوران ہی سرکارِ دوعالم ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے، پھر فرمانے لگے کہ کسی کو زیادہ کسی کو کم نصیب ہوتی ہے، کوئی جاگتے ہوئے آپ ﷺ کے دیدارِ پُر انوار کا نظارہ کرتے ہیں۔ اسی پر تبسم فرمایا کہ ناچیز نے ایسی خوبصورت مسکراہٹ عالم میں نہ دیکھی تھی۔ وجدان یہی کہتا ہے کہ آپ تب بھی جذب کی حالت میں دیدار کی لذتوں سے بہرہ ور ہو رہے تھے۔

ان کی محفل میں نصیرؔ، ان کے تبسم کی قسم
دیکھتے رہ گئے ہم ہاتھ سے جانا دل کا

اسی لمحے یہ چاہتا تھا کہ کائناتِ عالم کی ساری دولت ان کے درِ دولت اور قدم اقدس پر قربان کردی جائے، آپ کی آواز اس قدر دھیمی اور لہجہ اس قدر پُر تاثیر تھا کہ آپ کی محفل سے اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

ناچیز کے دل میں یہ بات القا ہوئی کہ اللہ نہ کرے آپ کا وصال ہو جائے، میں آپ کو پا نہ سکوں تو کیا ہوگا؟ اسی لمحے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمانے لگے! پیر مر کر بھی زندہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص (چلّا) کر رہا تھا، اس نے اپنے پاؤں کنویں میں لٹکائے ہوئے تھے کہ پانی یکا یک کنویں سے چھلکا، چلّا کرنے والا شخص گھبرا کر پیچھے ہونے لگا تو اسی لمحے اس کے پیر و مرشد تشریف لے آئے اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ! گھبراؤ نہیں ہم تمہارے پیچھے ہی ہیں۔ تب ناچیز کے دل نادان کو تسلی ہوگئی۔

عشقِ رسالت مآب ﷺ سے چمکنے والا یہ دل اور چہرہ ہر وقت مرجع خلائق رہا۔ ناچیز کو کمسنی کی وجہ سے بعض حقیقتوں کا علم نہ تھا، مگر جب حقیقت میں فوائد الفواد کی ورق گردانی کے بعد مرشدِ پاک کے درِ دولت کے انوار و تجلیات کی یادیں آتی ہیں تو زبانِ حال سے یہی نکلتا ہے، اہلِ چشت! اہلِ بہشت،،،،۔ وعظ و نصیحت بھی جاری رہا۔ قلوب کا تزکیہ بھی جاری رہا، دین کی تبلیغ بھی فرمائی جاتی رہی اور لنگر سے نفس و روح دونوں کو بیک وقت متقی بھی کیا جاتا رہا۔ دل سے نکلنے والی ہر آواز، ہر آس، ہر امید، ہر مانگ برآتی رہی۔ کسی سائل کو شکستہ دل یا خالی ہاتھ لوٹتا نہ پایا کہ یہ در، اہلیانِ چشت کے باغوں میں سے ایک باغ تھا۔

مرشدِ پاک کے مرشدِ عظیم حضرت خواجہ زین الدین چشتی نظامیؒ کے تجلیات کا رنگ درویشانہ نمایاں تھا۔ سادگی اور خلوص کی انتہا تھی۔ آپ جب بھی اپنے مرشدِ پاک کا ذکر سنتے تو وجد کے عالم میں آ کر کھڑے ہو جاتے۔ محبت کے عالم میں جھوم جھوم کر یاد کرتے کہ یہ رعنائی انھی کی

عطاو کرم کا فیض تھی۔اس درِ انور کے تجلیات میں وہی قدیم امن ومحبت ، بھائی چارے کی فضا مہک رہی تھی۔محبت ہی محبت، کرم ہی کرم، عطا ہی عطا اور فیض ہی فیض تھا۔

ناچیز کو یہ سعادتِ عظمیٰ تین مرتبہ حاصل ہوئی کہ درِ دولت کو بوسہ دیا، آخری ملاقات کو جب کراچی رختِ سفر باندھا تو دل موہوم سا تھا۔جونھی آپ کی دید کا شوق بڑھا تو فوراً اپنے برادر کو ساتھ لیے سرکار کی خدمت میں حاضری کے لیے دوڑ پڑا، وقت نے وفا نہ کی۔عین اسی دن جب ہم شوقِ ملاقات کی خاطر درِ دولت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آپ کا وصال ہو گیا ہے۔(۱۲ جمادی الاول، ۱۴۲۴ھ،۱۳ جولائی ۲۰۰۳ء) مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپ کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوا۔ آپ کا مزار کراچی میں مرجع خلائق ہے۔

نامۂ لاہور

ڈاکٹر معین نظامی صاحب

شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی۔لاہور

''سہ ماہی مجلّہ ''قندیل سلیماں'' کے آغاز اور اس کے پہلے شمارے کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔خدا کرے اس کے بہتر سے بہتر انداز میں جاری رہنے کے اسباب وافر فراہم رہیں۔آپ نے عنایت فرمائی اور پہلا شمارہ ارسال کیا، اس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔
مجموعی طور پر شمارہ مجھے بہت پسند آیا۔امید ہے آپ کی مساعیِ جمیلہ سے اس کا کیفی وکمی معیار برقرار رہے گا۔''

تصوّف

(دوسری قسط)

سید شاکر القادری چشتی نظامی ☆

گزشتہ قسط میں ہم نے لفظ تصوف کی لغوی ابحاث کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ موجودہ قسط میں ہم اس کی معنوی اور مرادی ابحاث کا جائزہ لیں گے۔ جس طرح علما اور محققین نے تصوف کے لغوی مفاہیم کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے بالکل اسی طرح صوفی اور تصوف کی معنوی تعریف میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہر صوفی نے اس کی تعریف اپنے ذوق اور حال کے مطابق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی صوفی کی بیان کردہ مختلف تعریفات بظاہر باہم متعارض نظر آتی ہیں لیکن ذوق و وجدان اور حال و قال کی مختلف کیفیات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تضاد بالکل ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ایک صوفی جب راہِ سلوک کو طے کرتا ہوا مختلف احوال و مقامات سے گزرتا ہے تو وہ ہر حال اور ہر مقام کی نسبت سے تصوف کی تعریف و تعبیر بھی کرتا ہے، جیسا کہ حضرت جنید بغدادیؒ کے صحبت یافتہ ایک صوفی ابراہیم بن المولد الرقی (متوفی: ۳۴۲ ہجری، ۹۵۳ عیسوی) نے تصوف کی سو سے زیادہ تعریفیں کی ہیں۔ بہر حال تصوف اور صوفی کی جس قدر بھی معنوی تعریفیں اور تعبیریں کی گئی ہیں اگرچہ وہ تمام کی تمام جامع ہیں لیکن ہم عام الفاظ میں تصوف کی ایک جامع تعریف یوں کر سکتے ہیں:

''تصوف ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سعادتِ ابدی کے حصول کی خاطر تزکیہ نفس، تصفیہ اخلاق اور ظاہر و باطن کی درستی و یکسانیت کے احوال و افعال کا علم و عمل حاصل ہوتا ہے''

شیخ ابو حمزہ بغدادیؒ فرماتے ہیں:

☆ مدیر: سہ ماہی فروغِ نعت، اٹک

''سچے صوفی کی علامت یہ ہے کہ وہ امیر سے فقیر، معزز سے ذلیل اور مشہور سے گم نام ہو جائے۔ جبکہ جھوٹے صوفی کی نشانی یہ ہے کہ وہ فقیر سے امیر، ذلیل سے معزز اور گمنام سے مشہور ہو جائے''۔[1]

حضرت ابوالحسن نوریؒ کا قول ہے:

''صوفیاں آن قوم اند کہ جانِ ایشان از کدورتِ بشریت آزاد گشتہ است واز آفتِ نفس صافی شدہ واز ہوا، خلاص یافتہ تا درصفِ اول و درجہ اعلیٰ با حق بیارامیدہ واز غیر رمیدہ''[2]

ترجمہ:

صوفیہ ایسی جماعت ہیں جن کی جانیں کدورتِ بشری سے آزاد اور آفاتِ نفسانی سے محفوظ ہو چکی ہیں۔ انھیں ہوا و ہوس سے خلاصی مل چکی ہے۔ یہ حق تعالیٰ کے ساتھ صفِ اول میں اعلیٰ درجات کے ساتھ آرام سے ہیں اور غیر اللہ کے خیالات سے دور ہیں۔

مشہور صوفی حضرت شیخ سہل بن عبداللہ تستریؒ[3] فرماتے ہیں:

''صوفی وہ ہے جو میل کچیل سے پاک ہو، ہمہ تن غور و فکر ہو، مخلوق کو چھوڑ کر اللہ ہی کا ہو گیا ہو اور اس کے نزدیک سونا اور مٹی برابر ہوں''[4]

حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں:

''تصوف نہ رسوم است و نہ علوم لیکن اخلاق است یعنی اگر رسوم بودے بمجاہدہ بدست آمدے واگر علوم بودے بہ تعلیم حاصل شدے بلکہ اخلاقی است کہ تخلقو ا با خلا ق ا للہ''[5]

ترجمہ:

تصوف نہ رسوم کا مجموعہ ہے اور نہ علوم کا نام ہے بلکہ سراسر اخلاق ہے یعنی اگر یہ رسوم کا مجموعہ ہوتا تو مجاہدہ اور کوشش سے حاصل ہو جاتا اور اگر یہ کوئی علم ہوتا تو پڑھنے لکھنے سے آ جاتا۔ یہ تو اخلاق ہے کہ اپنے آپ اخلاق الٰہیہ سے سنوارو۔

شیخ بایزید بسطامیؒ نے صوفیہ کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

''الصوفیہ اطفال فی حجر الحق (صوفیہ آغوشِ حق میں بچے ہیں)''[6]

شیخ ذوالنون مصریؒ سے صوفیہ کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:
''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر ترجیح دی تو اللہ نے انھیں ہر چیز پر ترجیح دی'' ۷

شیخ نوریؒ فرماتے ہیں۔ ''صوفی کی صفت یہ ہے کہ جب اس کے پاس کچھ نہ ہو تو خاموش رہے اور جب ہو تو ایثار کرے'' ۸

حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے: ''صوفی کی مثال زمین کی سی ہے جس پر ہر قبیح شے گرتی ہے لیکن اس سے صرف اچھی شے باہر نکلتی ہے'' ۹

حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید شیخ ابوبکر شبلیؒ کا قول ہے:
''الصوفی منقطع عن الخلق و متصل بالحق (ترجمہ: صوفی خلق سے جدا اور حق سے متصل ہے'' ۱۰

شیخ الاسلام حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ فرماتے ہیں۔
''اے درویش! تصوف یہ ہے کہ تمہاری ملکیت میں کچھ باقی نہ رہے اور تم کہیں موجود نہ ہو۔ اے درویش! تصوف صاف دلی کے ساتھ مولیٰ کی دوستی کا نام ہے اور صوفیہ دنیا و آخرت میں سوائے محبتِ مولیٰ کے اور کسی چیز پر فخر نہیں کرتے۔ اے درویش! صوفی وہ ہے جس کا دل اتنا صاف ہو کہ کوئی چیز اس کی صفائی قلب کے سامنے چھپی ہوئی نہ ہو۔ اے درویش! اہل تصوف حق میں ایسا ڈوب جاتے ہیں کہ ان کو کسی مخلوق کی ضرورت نہیں رہ جاتی اور بات چیت ان کے درمیان سے ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہ حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہتے ہیں اور تا زندگی حق تعالیٰ کے دوست رہتے ہیں۔'' ۱۱

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی تصنیفِ لطیف سرّ الاسرار میں لفظ تصوف کے حروف کی روشنی میں اس کے معانی و معارف بیان فرمائے ہیں۔ آپ کے نزدیک تصوف کی تمام تر تعلیمات کا نچوڑ لفظ ''تصوف'' کے چار حروف میں موجود ہے۔ سلوک، شریعت، طریقت اور حقیقت کی تمام منازل اور ان کے آداب انھی چار حروف سے ماخوذ تصورات کی تفصیل ہیں، یہاں

ہم سِرّ الاسرار کی عربی عبارت نقل کیے بغیر اس سے اخذ شدہ نکات مختصراً بیان کرتے ہیں:

''حرف تا (ت)۔۔۔۔۔ لفظ تصوف کا پہلا حرف (ت) توبہ سے لیا گیا ہے اور توبہ گناہوں کی آلودگیوں سے اللہ رب العزت کے احکامات کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف ظاہری اور باطنی طور پر مکمل رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔

حرف صاد (ص) سے مراد صفائی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔صفائے قلب ۲۔صفائے سِرّ

صفائے قلب یہ ہے کہ دل ان بشری کدورتوں سے پاک ہو جائے جو عموماً دل کے اندر پائی جاتی ہیں مثلاً زیادہ کھانے، پینے، سونے اور زیادہ گفتگو کرنے کی خواہش۔ نیز دنیوی رغبتیں مثلاً زیادہ کمائی، کثرتِ جماع اور اہل و عیال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت۔ اسی طرح غرور، تکبر، کینہ، حسد، نفرت، بغض، عناد، سرکشی، عداوت، منافقت، کدورت اور تعصب جیسے نفسانی اور اخلاقی رذائل جن سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اگر دل ان تمام سے منزہ و مبرا ہو جائے تو اسے صفائے قلب کہتے ہیں۔

صفائے سِرّ۔۔۔ قلب جسم کا باطن ہوتا ہے اور سِرّ قلب کا بھی باطن ہوتا ہے۔ مقامِ سِرّ کی صفائی سے مراد ہے کہ نہ صرف دل کی ظلمتیں دھل جائیں بلکہ دل ماسوا اللہ کے خیال سے اس طرح پاک ہو جائے کہ اس کا تصور تک نہ رہے۔ تو جب ماسوی المحبوب ہر چیز کے گمان و تصور سے بے نیاز ہو کر دل محبوبِ حقیقی کے انوار و تجلیات میں گم ہو جائے تو اسے صفائے سِرّ کہتے ہیں۔

حرف (واؤ)۔۔۔ سے مراد ولایت ہے۔ یہ ایک مرتبہ ہے جو تصفیہءِ قلب کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ (ولایت کو عرفِ عام میں دوستی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور صاحبِ ولایت کو ولی کہتے ہیں اس اعتبار سے ولی اللہ کے معنی ہیں اللہ کا دوست) چنانچہ ارشادِ باری ہے کہ: بے شک اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم ان کے لیے دنیا کی زندگی اور آخرت میں خوش خبری ہے۔ ولایت کا ماحصل یہی ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاقِ الٰہیہ پیدا کر لے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کرو۔ (اسی طرح) حدیث

قدسی میں اللہ کا فرمان ہے: جب میں کسی بندے کو دوست رکھتا ہوں تو میں اس کے کان، آنکھ، زبان اور ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں پھر وہ میرے ہی واسطے سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے۔

حرف فا (ف)۔۔۔ سے مراد فنا فی اللہ ہے۔ جب صفاتِ بشری فنا ہو جاتی ہیں تو صفاتِ باری تعالیٰ باقی رہ جاتی ہیں۔ چونکہ اس ذاتِ باری کو نہ زوال ہے اور نہ ہی فنا ہے۔ لہٰذا عبدِ فانی کو اس ذاتِ غیر فانی کے ساتھ اس کی پسندیدگی اور قبولیت سے باقی باللہ کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور قلب فانی کو سرّ باقی کے ساتھ بقا حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ لہٰذا اس کی ذات اور خوشنودی کے لیے اعمالِ صالحہ کی کوفت برداشت کرنا چاہیے۔ جب بندہ اللہ کی رضا پالیتا ہے تو اس برگزیدہ اور پسندیدہ بندے کو راضی ہونے والی ذات (اللہ) کے ساتھ بقا حاصل ہو جاتی ہے اور اعمالِ صالحہ کا ماحصل یہ ہے کہ وہ انسانِ حقیقی (جو اس کے باطن کے اندر ہے) جسے طفل المعانی کہتے ہیں زندہ ہوتا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''پاکیزہ کلام اور نیک کام اسی کی طرف بلند ہوتا ہے۔ وہ اسے بلند کرتا ہے۔''

ہر وہ عمل جس میں غیر اللہ کی شرکت ہو اس کے عامل کی ہلاکت کا باعث ہے۔ مکمل فنا کے بعد عالمِ قرب میں بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ جب فقیر مکمل ہو جاتا ہے تو صوفی کو ہمیشہ کے لیے بقا ہے اور الحق کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

''اہلِ جنت ہمیشہ اس (جنت) میں رہیں گے۔''

نیز فرمایا: ''اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔''

جاری۔۔۔۔۔۔۔

حواشی وحوالہ جات:

ا۔ اللمع؛ ص ۴۴

۲۔تاریخ تصوف دراسلام بحوالہ تصوف اورسرّیت از پروفیسر لطیف اللہ ص ۱۱۶۔

۳۔مشہور صوفی حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ جو کہ حضرت ذوالنون مصریؒ کے خاص مریدین میں سے ہیں۔صوفیہ کے خیالات وافکار کی ترجمانی میں قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی اور کتبِ تصوف میں ان کے اقوال کو خاص اہمیت حاصل ہے۔طریقۂ سہلیہ انھی سے منسوب ہے(سفینۃ الاولیا،تذکرہ سہل بن عبداللہ تستریؒ)

۴۔التعرف ص ۵۔

۵۔تاریخ تصوف دراسلام بحوالہ تصوف اورسرّیت از پروفیسر لطیف اللہ ص ۱۱۶۔

۶۔التعرف ص ۹۱،الرسالۃ القشیریہ میں یہ قول حضرت ابوبکر شبلیؒ سے منسوب ہے۔

۷۔الرسالۃ القشیریہ ص ۱۶۶،اللمع ص ۴۶۔۴۵۔

۸۔الرسالۃ القشیریہ ص ۱۶۶۔

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔اسرار الاولیا،اُردو ترجمہ ملفوظات حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ از شیخ بدرالدین اسحاق مترجم پروفیسر معین الدین دردائی،یو پبلشرز لاہور،سال ۲۰۰۷ء،ص ۱۱۲۔

گوشۂ نذر صابریؒ

قطعۂ تاریخِ وصال

حضرت نذر صابریؒ

وہ آگاہِ آداب و اسرارِ چشت
بہ عشقِ محمد فروزاں سرشت
کہو سالِ وصل اُن کا با "جیم" و "کاف"
"غلامِ محمد مکینِ بہشت"

۳+۲۰+۱۹۹۰=۲۰۱۳ء

نتیجۂ فکر: ارشد محمود ناشاد

نذر صابری رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر اہلِ علم کے تأثرات

مرتب: ارشد محمود ناشاؔد

نذر صابری ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارہ اور دبستان تھے، اٹک کے لیے ان کا وجودِ مسعود نعمتِ غیر مترقبہ سے کسی طور کم نہ تھا۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو علم وادب اور شعر وسخن کی محفلوں میں جیسے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ انھوں نے اس زرخیز اور شاداب علاقے کے گم شدہ آثار کی تلاش وجستجو اور تازہ واردانِ ادب کی تراش خراش کو بہ رضا ورغبت اپنا وظیفۂ حیات ٹھہرایا۔ پینسٹھ سال کے طویل عرصے تک وہ اُسی جذب وشوق اور فعالیت وسبک خرامی کے ساتھ یہ وظیفہ انجام دیتے رہے۔ اٹک کے علمی وادبی آفاق کو وسعت آشنا کرنے اور زمانوں کی گرد میں دبے ہوئے آثارِ علمیہ کو تلاش کر کے عالم بہ کنار کرنے میں انھوں نے جو کوششیں کی ہیں، وہ لائقِ تحسین ہی نہیں قابلِ قدر بھی ہیں۔ ان درخشاں خدمات کے حوالے سے کیمبل پور کی دھرتی ابدالآباد تک ان کی احسان مند رہے گی۔ نذر صابری صاحب نے اٹک میں دو علمی وادبی تنظیموں: محفلِ شعروادب اور مجلسِ نوادراتِ علمیہ کی داغ بیل ڈالی۔ ان تنظیموں کے قیام کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ دونوں تنظیمیں حکومتی سرپرستی کی عدم موجودگی، مالی حالات کی ناہمواری اور اہلِ زر کی عدم توجہی کے باوجود آج بھی سرگرمِ عمل ہیں۔ ان تنظیموں کے رگ وپے میں نذر صابری اور ان کے ایثار پیشہ رفقائے کار کا اخلاص خون بن کر دوڑ رہا ہے۔

۱۱ر دسمبر ۲۰۱۳ء کی صبح ساڑھے تین بجے یہ آفتابِ علم غروب ہوا، کیمبل پور پر اداسی کی چادر تن گئی، محفلیں اُجڑ گئیں، فضا سوگوار ہو گئی۔ نذر صابری کی وفات سے علم وادب، تحقیق وآگہی کا ایک باب ختم ہوا۔ اللہ کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ دے اور انھیں اعلیٰ علیین میں مقامِ بلند سے سرفراز فرمائے۔ چند اہلِ علم ودانش نے صابری صاحب کی رخصت پر اپنے تأثرات پیش کیے ہیں، جو ہدیۂ قارئین ہیں:

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور):

نذر صابری منصب اور پیشے کے اعتبار سے کتاب دار تھے، اس کے ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب، عالم اور محقق بھی تھے۔ انھوں نے اپنے علم و فضل سے بہت سے طلبہ کو فیض یاب کیا۔ بہت سے تحقیق کاروں کو تحقیق کے اسالیب اور طریقوں سے آشنا کیا۔ انھوں نے ایک لمبے عرصے تک گورنمنٹ کالج اٹک میں اساتذہ، صاحبانِ ذوق اور طلبہ کی علمی و ادبی مجالس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ ان مجالس کے گوناگوں فکری مباحث نے سیکڑوں ذہنوں کی آب یاری کی، جنھوں نے آگے چل کر وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی میں، مختلف شعبوں (صحافت، ادب، تعلیم وغیرہ) کے حوالے سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ صابری صاحب نے نہایت بامقصد زندگی گزاری۔ ان کی مقصدیت خود ان کے لیے راحت، سکون اور ایک روحانی مسرت و طمانیت کا باعث رہی اور اب ان کے عزیز، دوست اور ان سے کسب فیض کرنے والے ان کے حوالے سے تادیر ایک روحانی لذت کشید کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر سفیر اختر (واہ کینٹ):

ادیب، شاعر، کتاب دوست اور کتاب شناس مرحوم نذر صابری ایک فرد کا نہیں بل کہ ایک انجمن کا نام تھا۔ انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد اٹک کو وطنِ ثانی بنایا تو وہ گورنمنٹ کالج، اٹک میں لائبریرین تھے۔ لائبریری میں انھیں شاذ ہی کسی نے تنہا پایا، وہ ہمیشہ صاحبِ علم و دانش اساتذہ اور جویانِ علم کے درمیان گھرے ہوئے پائے گئے۔ محفلِ شعر و ادب، مجلسِ نوادراتِ علمیہ اور ادارۂ فروغِ تجلیاتِ صابریہ ان کی سرگرمیوں کے مختلف نام تھے۔ انھوں نے ان علمی و ادبی مجالس کے توسط سے ضلع بھر کے اہلِ علم و ادب کو پلیٹ فارم مہیا کیا، ضلع کے نوجوانوں کو آگے بڑھایا، ماضی کے علمی ورثے کی حفاظت کی اور ذاتی کاوشوں سے ایک ایسی روشن مثال قائم جو قابلِ قدر ہے اور باعثِ تقلید بھی۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اٹک کے باسیوں کو ان کی یادگار مجالس کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

ڈاکٹر عارف نوشاہی (اسلام آباد):

۱۱ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو نذر صابری صاحب کے اِس دُنیا سے چلے جانے کے ساتھ ہی اس دارِ فانی میں میرے اور اُن کے درمیان تقریباً چالیس سالہ علمی و قلبی تعلق کا رشتہ بھی کٹ گیا۔ میں ان کو محترم رکھتا تھا اور وہ مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ وابستہ میری یادوں اور مراسلت کا ایک طویل دور ہے جو کسی مفصل مقالے کا متقاضی ہے یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اُن کی شخصیت کا ایک پہلو فارسی عرفانی ادب کے محقق کا بھی ہے۔ انھوں نے فارسی رسالہ غایۃ الامکان اُس کے اصل مصنف (اُشنوی) کی شناخت کے ساتھ اُس وقت اٹک سے شائع کیا جب ایران اور برصغیر میں محققین مصنف کے بارے میں غلطیوں پر غلطیاں کر رہے تھے۔ صابری صاحب کی تحقیق چھپ کر آئی تو اسے نجیب مایل ہروی جیسے محقق نے بھی تسلیم کیا۔ منہج الرشاد از زین الدین خوافی کے قدیم مخطوطہ کی دریافت کی تحسین بھی صابری صاحب کے لیے ہے۔ خدا اُن کے درجاتِ اُخروی بلند فرمائے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ (لاہور):

نذر صابری صاحب غیر منقسم پنجاب کی ہری شاخ تھے۔ مذہبی بھید بھاؤ سے آزاد۔ جالندھر کے پنجابی تھے لیکن فارسی زبان کو آخر دم تک سینے سے لگائے رکھا۔ انھیں وقت کے جبر نے سرحد اور پنجاب کی سرحد پر دھکیل کر امتحان میں ڈال دیا تھا نتیجتاً وہ ساری زندگی سابق کیمبل پور حال اٹک کی تاریخ، ثقافت اور ادبی وایت کو کھوج کر یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے کہ اس دھرتی کے ساتھ ان کا رشتہ کیا ہے؟ ستر کے دہے میں وہ دیوانِ شاکر کو منظرِ عام پر لائے تو ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد مسلسل تحقیق وتدوین سے جڑے رہنے کے سبب مشرقی پنجاب سے آئے نذر صابری صاحب مغربی پنجاب کے ایک دُور افتادہ علاقے اٹک اور اس کی چھاچھی تہذیب کی پہچان بن گئے۔ کلھم ہم سب جو اس علاقے کے باسی تھے وہ کُچھ نہیں کر پائے جو وہ تنِ تنہا کر گزرے۔

صاحب زادہ حسن نواز شاہ (اسلام آباد):

عالم کی موت کو موت العالم کہا گیا ہے یہ مقولہ جتنا راست ہے کثرتِ استعمال کے سبب اس کا برمحل استعمال اب اتنا ہی عامیانہ لگتا ہے۔ نذر صابری کی وفات یقیناً علم وادب کی دُنیا میں ایک بڑا نقصان ہے مگر: موت سے کس کو رستگاری ہے، صابری صاحب سے پہلی بار اٹک میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی والدۂ محترمہ کے جنازے پر ملاقات ہوئی اور دوسری ملاقات بھی ناشاد صاحب کی معیت میں ان کے گھر پر۔ تفصیلی ملاقات میں میں نے چشتیہ صابریہ سلسلے سے متعلق ایک اشکال ظاہر کیا، پھر کیا تھا وہ بولتے چلے گئے اور میں حیرت سے ٹکر ٹکر ان کے چہرے کو دیکھتا رہا کہ کس طرح عقیدت اور تحقیق کے دھارے بین بین چل رہے ہیں۔ ان کے علمی آثار پر تفصیلی کلام کا یہ محل نہیں البتہ یہ طے ہے کہ انھوں نے جو بھی کام کیا، ممکنہ حد تک اس کے بارے میں پکی پکی اطلاعات بھی ان کے پیشِ نظر رہیں اور یہ ان کی اپنے کام سے کامل وابستگی اور ان کی محنت وریاضت کا کھلا اظہار ہے۔ ایک اور پہلو سے بھی میں ذاتی طور پر ان کا نیازمند تھا کہ انھوں نے دو ایسے متون بھی مرتب کیے جن کا بلاواسطہ میرے موضوعِ تحقیق سے تعلق تھا یعنی شیخ تاج الدین محمود اشنوی اور شیخ زین الدین خوافی کی تصانیف کے متون کی تدوین۔ دونوں کا علی الترتیب کبروی اور سہروردی سلسلے سے تعلق تھا۔ صابری صاحب کے احوال وآثار پر ان کی حیات میں ہی اٹک کے ایک صاحب نے ایک کتاب ترتیب دی تھی گو وہ ایک نیازمندانہ اظہارِ عقیدت تھا اور ایسے جذبے کو بارہا سلام لیکن اس کتاب سے صابری صاحب کی شہرت اور قد میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ صابری صاحب کے مرتب کردہ دیوانِ شاکر اٹکی کو ایک صاضب نے من وعن اپنے نام سے چھپوالیا، اس عزیز نے گفتگو کرنا تو کجا اس سرقے اور دیدہ دلیری کی نشان دہی بھی نہیں کی۔ اب صابری صاحب کا خلق دیکھیے کہ انھوں نے اس پر کلام کرنا کبھی گوارا نہ کیا۔ خدا ان کے درجات میں اضافہ فرمائے۔

ڈاکٹر طاہر مسعود قاضی (اٹک):

معروف محقق، دانشور اور صاحب اسلوب نعت گو شاعر چودھری غلام محمد نذر صابری کے سانحہ ارتحال سے اٹک کے علمی حلقوں میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ وہ سچے اور سُچے عاشق رسول تھے۔ ''واماندگی شوق'' ان کی نعت نگاری کا شاہکار ہے۔ مرحوم بلا شبہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ضلع اٹک کے علمی سرمایہ کو سمیٹنے اور منصۂ شہود پر لانے کا کام انھوں نے تنہا نصف صدی سے زائدعرصہ تک سرانجام دیا۔ صابری صاحب مرحوم کی شخصیت ایک ٹاورنگ پرسنالٹی تھی۔ ان کے سفر آخرت پر چلے جانے سے ایک صدی اور ایک عہد کا اختتام ہوگیا۔ وہ ہجرت کا دکھ لیے جالندھر کی بو باس کے ساتھ اٹک کے مردم خیز علاقے کی پہچان تھے۔ خطۂ اٹک کے لیے ان کی خدمات کی وجہ سے پورا اٹک ان کے لیے سوگوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرما کر مرحوم کے علمی فیضان سے نواز دے (آمین)

محمد ساجد نظامی (مکھڈ شریف):

نذر صابری ایک معروف محقق، شاعر اور صاحب اسلوب انشا پرداز تھے۔ ۱۹۴۸ء کو کیمبلپور میں تشریف لائے۔ زندگی بھر کتاب کے ساتھ ان کا یارانہ رہا۔ وہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں کتابدار رہے۔ ایک ایسا کتابدار، کتاب ہی جس کا حوالہ تھا اور وہ خود کتاب کے لیے ایک حوالہ۔ شہر اٹک میں وہ روشنیوں کا استعارہ تھا، اسی کے دم سے سبھی محفلیں آباد تھیں۔ اس کی اپنی کٹیا ہو کہ کتب خانہ مقبولِ عام پائیلٹ اسکول کے لان ہوں کہ مسجد کا صحن، سبھی جگہوں پر وہ محفل جمالیا کرتا ہے۔ اُس کی شخصیت سے پیار کرنے والے لوگ یوں اُس کے گرد طواف کرتے جیسے شمع کے گرد پروانے۔ اُس پیکر دلربا کی خوبیوں سے ناآشنا لوگ اجنبیوں کی طرح لمحہ بھر رُکتے اور چلے جاتے۔ وہ مردِ خود آگاہ و خدا آگاہ عجب عالمِ بے نیازی میں اپنی گفتگو جاری رکھتا۔ اُسے اپنے سامعین کی ذات کا ادراک ہوتا، ہاں بارہا اُس کا سامع اُس کی گفتگو کا ادراک نہ رکھتا تو کئی طرح کے توہمات کا شکار ہو کر اُس کی محفل سے ہی اُٹھ جاتا۔ اہلِ نظر اُس جانے والے کی قسمت پر نالاں ہوتے۔ بے لاگ

تبصرے ہوتے، عالمِ امکاں سے عالمِ بالا تک رسائی تھی اُس کی، انتہا کا حافظہ تھا میرے ممدوح کا، چٹکلے اور قہقہے بھی سننے میں آتے۔ گھنٹہ بھر کی نشست میں چائے کے کئی دور ہو جایا کرتے۔ ہر بار اجازت لینے پر ایک چائے کا اور کپ پینے کا وعدہ لیا جاتا، پھر جانے کا عندیہ سنایا جاتا۔ اُس کی ہر محفل ایک خاص کیفیت سے مملو ہوتی جس میں وہ خود اور سامع بھیگتے چلے جاتے، بھیگتے چلے جاتے۔ اُن لمحات کو سوچتا ہوں تو ایسے لگتا ہے اِک خواب کا عالم تھا جو آنکھ کھلنے کے بعد آنکھوں کو بھگو گیا۔ اب شاید ان آنکھوں کے بند ہونے تک، ان کی نمی مجھے ہمیشہ اپنے ممدوح کی یاد دلاتی رہے گی۔ یہ سطور لکھتے وقت اسی نمی سے اُمنڈتے کچھ قطرے میرے چہرے پر عجب ٹیڑھی میڑھی لکیریں بناتے مٹی کی پیاس بجھاتے مٹی کو بھی نمی عطا کر گئے۔ میرے ممدوح نے تو مٹی کی ردا اوڑھ کر اُس کی بے قراری کو قرار دیا لیکن یہاں میں عجب بے قراری کے عالم میں تڑپتا ہوں۔

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

حضرت نذر صابریؒ

ترے طلوع سے بستانِ ایزدی روشن
زمیں منور و چرخِ زبرجدی روشن

ترے ظہور سے بزمِ الست رخشندہ
ترے فروغ سے اقلیمِ سرمدی روشن

ترے جمال سے احوالِ منتہی تاباں
ترے خیال سے افکارِ مبتدی روشن

ازل سے تا بہ ابد تیری جلوہ پاشی سے
ظہورِ کُن کی یہ بہتی ہوئی ندی روشن

انھی کے نام سے کرتا ہوں اکتسابِ ضیا
کہ جن کے دم سے رہی چودھویں صدی روشن

کرم نہیں ہے اگر یہ تو اور کیا شے ہے
مری نظر میں رہی میری ہر بدی روشن

مجھے بھی اس مہِ تاباں کی اِک کرن ہو عطا
ہے جس سے روحِ بلالؓ و دلِ عدیؓ روشن

منقبت حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

ولیوں کے سردار، معین الدینؒ
دو جگ کے مختار، معین الدینؒ

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

تجھ میں خواجہ گُن ہی گُن ہیں
میں ہوں اوگن ہار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

ٹوٹی نیّا ، دُور کنارا
کیسے لگوں اُت پار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

تیر ی دیا کی گر ہو نجریا
نیّا پڑے منجدھار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

کو ئی تجھے گن ہار پکارے
کوئی کہے اوتار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

جو رچنا ہے تیرے دوارے
نہ کاشی ہردوار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

گیان دھیان کے سارے رسیا
جائیں تورے بلہا ر

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

ہند ترے انوار سے پُر ہے

جیسے سُر سے تار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

یاد میں توری نین برسیں

جیسے میگھ بہار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

دل کی نگریا سونی سونی

تجھ بن سرکار

معین الدینؒ ـــــ کرپا کرو جی سرکار

۞

نوحہ

(نذرِ صابری کے لیے ایک نظم)

عبدالعزیز ساحر

شہر خاموش تھا
رات سوئی پڑی تھی
کسی کنجِ تاریک کے ایسے ویراں کدے میں
جہاں گردشِ وقت تھم سی گئی تھی
جہاں ہجر کے قافلے رک گئے تھے

جہاں دل کی دنیا میں محشر بپا تھا
جہاں درد کے موسموں کو
خزاں رُت کے بے کیف، بے رنگ، بے بو مناظر سے ڈر لگ رہا تھا
جہاں پھول شاخوں سے اُڑ اُڑ کے گرنے لگے تھے
جہاں ہر طرف دھند پھیلی ہوئی تھی
جہاں اوس پڑنے لگی تھی
خیالات وافکار کے بانکپن پر
وہاں رات لپٹی پڑی تھی
کسی کنجِ تاریک کی کروٹوں میں کہیں
ہجر کی اور اداسی کی چادر کو اوڑھے ہوئے
اُس گھڑی وہ غلامِ شہِ دو جہاں
آں سوئے آسماں
محوِ پرواز تھا
لگ رہا تھا کہ اِن بیکراں آسمانوں کی پہنائیوں میں کہیں

سارے رنگوں کو اور خوشبوؤں کو لیے
خیر مقدم کو آیا ہو جیسے کوئی
جس گھڑی بزم عالم سے وہ اُٹھ چلا
(بامِ خاور پہ اک نور سا چھا گیا)
اُس کی رحلت کا سُن کے ہوا سر پٹکنے لگی
آسماں رو پڑا
اور زمیں بین کرنے لگی

وہ قلندر تھا
یا پھر وہ درویش تھا
یا کرامت تھا وہ شاہِ رمدا اس کی
جو مدینے کی خوشبو میں گوندھی گئی
اُس کی سیرت میں
اور اُس کے کردار میں
اک شکن بھی نہیں تھی کہیں
اِس میں کچھ شک نہیں
وہ قلندر بھی تھا اور درویش بھی
اُس کو غوثِ زماں بھی کہو برملا

کس کو ادراک ہے اُن مقامات کا
جن میں وہ اُڑ رہا تھا
غبارِ مدینہ کو اوڑھے ہوئے
وہ کسی کے دیارِ عقیدت میں تھا
زندگی بھر رہا
اور غروب ہو گیا

آخری خط

[نذر صابریؒ بہ نام محمد ساجد نظامی]

۱۱ستمبر ۲۰۱۳ء

ڈیئر ساجد!

سلام و نیاز کے بعد صدق دل معافی کا طلبگار ہوں۔ مجھے یاد نہیں دکھ میں آپ کو کیا کیا کہہ گیا تھا۔ روا تھا یا ناروا، دونوں صورتوں میں معذرت خواہ ہوں۔ حسن: ناراض ہوتا ہے، بگڑتا ہے تو اس میں ہزار بناؤ سنگھار ہوتے ہیں۔ بہت ہی خوب صورت خط لکھ گئے ہو۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ خاص کر یہ کہ یہ سب کچھ مولاناؒ[۱] کی اجازت سے ہوا۔ اس سے پہلے بھی ایک جملہ آیا ہے جو لا جواب ہے۔ بھلا کون سا ہے بوجھیے تو۔

کچھ نہ ہونے کے باوجود آپ نے مجھے بہت کچھ بنا دیا ہے۔ آپ کا ہر خط محبت سے بھرا ہوتا ہے، مجھے اس قدر پیار بھرے خط شاید ہی کسی نے لکھے ہوں گے۔ کبھی آؤ تو دکھاؤں گا۔ ان شاء اللہ۔

''قندیل سلیماں'' میں دو تین باب مستقل کر دیں۔ ہر باب میں لکھنے والے مختلف ہوں۔ اس سے رنگا رنگی پیدا ہو گی جو بڑی دلچسپی کا باعث ہو گی۔ زیادہ طویل مضمون ہوں تو قسط وار کر دیں۔

ایک باب نوادر کا ہو۔ اپنے سو[۱۰۰] مخطوطات[۲] کی ایک قسط شائع کر کے خاموش ہو جائیں۔ رسد کے کم کرنے سے طلب کو آگ لگائیں۔ گرمیِ بازار پیدا کریں۔

والسّلام

نذر صابری

۱۔ حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی (م۔۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء) تفصیلی حالات کے لیے ''مہر تاباں'' مرتبہ: مولانا محمد الدینؒ مکھڈی، ''محراب دعا'' مرتبہ: محمد ساجد نظامی، قندیلِ سلیماں کا پہلا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ کتب خانہ مولانا محمد علیؒ مکھڈی میں جہاں کل کتب و رسائل کی تعداد ۱۵،۰۰۰ سے زائد ہے۔ ان میں ۱۲۰۰ کی تعداد میں عربی و فارسی، پنجابی اور اردو میں مخطوطات کا ذخیرہ بھی محفوظ ہے۔ نذر صابری صاحب نے ۱۹۷۳ء میں فارسی کے ۲۳۴ مخطوطات کی فہرست شائع کرائی تھی۔ ان کی خواہش رہی کہ دیگر کتب کی فہرست بھی جلد شائع ہو جائے، خصوصاً مخطوطات کی۔ یہ انھیں مخطوطات کی فہرست سازی کی طرف اشارہ ہے۔ ان شاء اللہ اگلے شمارے سے ''نوادر'' کے عنوان سے مخطوطات کی فہرست قسط وار شائع کی جائے گی۔

دریچۂ انتقاد:

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں ارسال کریں۔)

کتاب: گیان نامے　　　　تدوین وتحشیہ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

ناشر: سرمد اکادمی، اٹک　　　　مبصر: ڈاکٹر عبدالواجد تبسم

اردو غزل کی تخلیق، تحقیق اور تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ پاکستانی زبانوں بالخصوص پنجابی زبان وادبیات کی نقد وتحقیق میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں انھوں نے زبان وادبیات کے بعض اہم موضوعات پرداد تحقیق دی ہے، جس کا ثبوت اُن کا وہ گراں قدر تحقیقی سرمایہ ہے جو منظرِ عام پر آنے کے بعد اہلِ نظر سے داد پا چکا ہے۔ تحقیق میں جس کدوکاوش، تن دہی، انہماک اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کی تقریباً سبھی تحریروں سے جھلکتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی تخلیق کو اس راہ میں حائل نہیں ہونے دیا بلکہ ہردو کو جُدا رکھا ہے البتہ اُن کا اسلوبِ بیاں جو شگفتگی کا حامل ہے، نے اُن کی تحقیق کو بھی رنگ آمیز کیا ہے مگر حقائق کے بیان میں کسی جا انحراف کی صورت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ زبان وادب کی تحقیق ہو یا متن کی تدوین و ترتیب، انھوں نے تحقیق کے بنیادی تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ زیرِ تبصرہ ''گیان نامے بہ نام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی'' ان کا تازہ تحقیقی اور تدوینی کارنامہ ہے جو اردو ادب کے معروف محقق، نقاد، ماہر لسانیات اور شاعر ڈاکٹر گیان چند اور معروف اقبال شناس ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مابین علمی وادبی مسائل کا احوال ہے اور مکاتیب کے مجموعے کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ فاضل مرتب نے جس محنتِ شاقہ سے ان مکاتیب کو مع حواشی وتعلیقات مرتب کیا ہے، کتاب کے مندرجات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

مکتوب نگاری ذاتی نوعیت کی چیز ہے اور عام طور پر دو اشخاص کے ذاتی حالات کے بیان کو محیط ہوتی ہے۔ یہ مکالمہ اگر دو علمی شخصیات کے مابین ہو تو اس کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے اور اس میں شخصی اظہار کے ساتھ ساتھ علمی مسائل بھی در آتے ہیں جن سے بعض اہم علمی امور میں راہنمائی کی جا سکتی ہے مگر ان کی ذاتی حیثیت اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور ان کے ذریعے کسی بھی پیچ در پیچ علمی شخصیت کی زندگی کے نہاں گوشوں تک رسائی ممکن ہے۔ زیرِ نظر خطوط بھی ڈاکٹر گیان چند کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کی

نقاب کشائی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے ڈاکٹر گیان چند کا ابتدائی تعارف بقول ان کے زمانہ طالب علمی (۱۹۶۴ء-۱۹۶۶ء) میں ان کی کتب کی بدولت ہوا جب کہ ان سے ملاقات اور خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۸۶ء میں استوار ہوا جب وہ اقبال اکیڈمی حیدر آباد دکن کے عالمی اقبال سیمی نار میں شرکت کے لیے حیدر آباد تشریف لے گئے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند پاؤں پر چوٹ آنے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور تھے لہٰذا مذکورہ سیمی نار کی صرف ایک نشست میں شرکت کر سکے۔ مکتوب الیہ اُن سے طویل ملاقات کے خواہش مند تھے اور کانفرنس کے آخری دن اُن سے ملاقات بھی طے تھی مگر دیگر امور کی انجام دہی مانع رہی چنانچہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ملاقات نہ ہونے کے باعث سیمی نار کے دوران میں انھیں ہوٹل سے ایک خط لکھا جس میں وعدہ خلافی کی معذرت چاہی اور اپنی محرومی پر اظہارِ افسوس کیا۔ اس خط کے جواب میں ۵ مئی ۱۹۸۶ء کو ڈاکٹر گیان چند نے اُن سے اپنے اوّلین خط میں ملاقات نہ ہونے پر دُکھ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد خط و کتابت کے اس سلسلے کا آغاز ہوا اور یہ ۲۰۰۱ء تک جاری رہا۔ زیرِ نظر خطوط میں بے تکلفی کی وہ فضا سامنے نہیں آتی جو عام طور پر خطوط میں نظر آتی ہے۔ اس کا ذکر فاضل مرتب نے کتاب کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید عمروں کا تفاوت ہے (گیان نامے، ص۳۴) یا پھر مراسلت کی کمی، کیوں کہ ۱۹۸۶ء تا ۲۰۰۱ء صرف تیس خطوط ہیں۔ انھیں اگر سال بہ سال دیکھا جائے تو ۱۹۸۶ء چار خطوط، ۱۹۸۷ء پانچ خطوط، ۱۹۸۸ء ۴ خطوط، ۱۹۸۹ء ۳ خطوط، ۱۹۹۰ء ۲ خطوط، ۱۹۹۱ء چار خطوط، ۱۹۹۲ء ایک خط، ۱۹۹۳ء ایک خط، ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں کوئی خط نہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ایک خط، ۱۹۹۷ء میں ایک خط، ۹۹-۱۹۹۸ء کوئی خط نہیں، ۲۰۰۰ء تین خطوط جب کہ ۲۰۰۱ء میں صرف ایک خط سامنے آتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر گیان چند سے جب مکتوب الیہ کی ملاقات ہوئی، اس وقت وہ ملازمت سے سبک دوش ہو رہے تھے اور متفکر تھے کہ اُن کا علمی و ادبی کام منظرِ عام پر آ جائے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی جیسی متحرک شخصیت سے اُن کے روابط ہوئے اور انھوں نے پاکستان میں ان کے علمی و ادبی کام کی اشاعت کا بیڑہ اُٹھایا۔ ان خطوط میں زیادہ تر اسی نوعیت کے مسائل سامنے آئے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی شخصیت کے بعض گوشوں پر ضرور روشنی پڑتی ہے بالخصوص ان کے مذہبی نظریات، ذاتی زندگی اور مستقبل کے منصوبوں سے متعلق بھی اہم معلومات سامنے آئی ہیں۔

کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ڈاکٹر گیان چند سے اپنے تعلق خاطر کی وضاحت بھی کی ہے۔ ان مکاتیب کی روشنی میں اُنھوں نے انھیں وضع دار، منکسر المزاج، مرنجان مرنج انسان پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیاوی نمود ونمائش سے عاری اور صاف گوانسان تھے مگر ان کی کتاب ''ایک بھاشا دولکھاوٹ'' کے سامنے آتے ہی اس تعلق میں دراڑسی پڑگئی اور مکتوب الیہ کے تصورات میں ان کی شخصیت مسخ ہونے لگی، اپنے مضمون میں انھوں نے اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان کے سحر سے نکلنے کی کوشش بھی کی اور اس کا انجام کچھ یوں ہوا: ''اب میں سوچتا ہوں کہ شاید میں بھی گیان چند کی شہرت کی تیز گامی کا شکار ہو گیا تھا۔'' (گیان نامے، ص۱۹)

اس کے بعد ''عرض مرتب'' کے عنوان سے فاضل مرتب نے ڈاکٹر گیان چند کی علمی وادبی خدمات اور پھر ان خطوط کی روشنی میں اُن کی شخصیت کے بعض اہم گوشوں سے نقاب کشائی کی ہے جو ڈاکٹر گیان چند کی شخصیت کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بالخصوص وہ ان کے مذہب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وہ (ڈاکٹر گیان چند) ملازمت سے سبک دوشی کے بعد مذہب کے مطالعے میں وقت گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ گیتا، بائبل اور قرآنِ حکیم کے مطالعے کی بھی آرزو تھی۔'' (ایضاً، ص۲۶)

فاضل مرتب اردو ادب بالخصوص تحقیق کے میدان میں اہم نام رکھتے ہیں اور اس سے قبل بعض اہم موضوعات پر دادِ تحقیق دے چکے ہیں۔ مکاتیب کے متن کی ترتیب اور خواندگی کی طرف اُنھو ں نے خصوصی توجہ کی ہے مگر اس کے باوجود کتابت، املا اور الفاظ کی اغلاط جو مکاتیب میں موجود تھیں، کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس ضمن میں بالخصوص اقبال کا درج ذیل مصرع نجانے کیسے ان کی نگاہ سے بچ کر غلط درج ہو گیا:

غلط مصرع: کیا مزا بلبل کو آیا شیوۂ بے دود کا (گیان نامے، ص۳۳)

صحیح مصرع: کیا مزا بلبل کو آیا شیوۂ بے داد کا

اس کے علاوہ کتابت کی درج ذیل اغلاط بھی قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ تحقیق کا فن کی اسلام آباد سے رسید نہیں آتی۔ (گیان نامے ص۵۱)

۲۔ کافی آگے چل کر خاقانی کے دور فارسی اشعار درج ہیں۔ (ایضاً،ص ۶۷)

۳۔ اقبال کی تعلیمات میں کون کون سے ایسی ہیں۔ (ایضاً،ص ۶۲)

۴۔ آغا سہیل کو یا کئی دوسرے کو کیا اعتراض؟ (ایضاً،ص ۶۳)

۵۔ فون کر کے میرے متوقع وردو کی خبر دیجیے۔ (ایضاً،ص ۶۸)

۶۔ جمیل جالبی صاحب صاحب کو لکھا ہے۔ (ایضاً،ص ۸۳)

ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مکاتیب میں (ص ۳۸، ۴۰، ۴۱، ۴۶، ۵۵، ۶۳، ۶۶) ''مشکور'' کا لفظ احسان منداور شکر گزار کے معنوں میں برتا ہے مگر فاضل مرتب نے اس غلطی پر کوئی وضاحتی حاشیہ نہیں لکھا۔ مزید برآں ڈاکٹر گیان چند نے اپنے خط نمبر ۷ (۲۴ ستمبر ۱۹۸۷ء) میں اردو کے دو نامور محققین قاضی عبدالودود اور رشید حسن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مذہب کے قائل نہیں تھے، دونوں کو دہریہ کہا جا سکتا ہے (گیان نامے،ص ۷)۔ اس ضمن میں بھی فاضل مرتب نے کوئی وضاحت نہیں کی۔ مکتوب الیہ کا مختصر تعارف بھی شامل کتاب ہونا چاہیے تھا۔

فاضل مرتب نے جس محنت اور لگن سے ان مکاتیب کو مرتب کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ ''گیان نامے'' سرمد اکادمی، اٹک کے زیرِ اہتمام اگست ۲۰۱۳ء میں اشاعت آشنا ہوئی ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور جاذبِ توجہ ہے جو سید شاکر القادری کی مہارت کا نتیجہ ہے۔ کتاب کی قیمت ۱۵۰ روپے ہے۔

خانقاہ معلیٰ مبارک حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ دہلی (انڈیا)

خانقاہ معلیٰ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (پاکپتن شریف)

QANDEEL E SULEMAN

مکھڈ شریف ضلع اٹک کا ایک منظر

دریائے سندھ کا ایک منظر